عالمی اقتصادی بحران

کی حقیقت اور اسلام کے نقطہ نظر سے اِس کا حل

شیخ عطا ابن خلیل ابورَشتہ

حزب التحریر

شیخ ابو یاسین ابن خلیل ابو رَشتہ ایک اسلامی فقیہ، عالم اور مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ حزب التحریر کے امیر بھی ہیں جو کہ ایک امیر کی قیادت تلے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سیاسی جماعت ہے۔

آپ 1943ء میں فلسطین کے ایک علاقے 'ہیبر ون' (Hebron) کے گاؤں 'رعنا' میں پیدا ہوئے۔ 1948ء میں اسرائیل کے ہاتھوں 'رعنا' کی تباہی کی وجہ سے آپ اپنے خاندان کے ساتھ ہیبر ون کے قریب ایک پناہ گزین کیمپ میں منتقل ہو گئے۔ آپ نے اپنی تعلیم کا حصول ہیبر ون، یروشلم اور قاہرہ کے تعلیمی اداروں سے کیا اور سول انجنیئرنگ میں ڈگری حاصل کی۔

شیخ عطاء نے 50ء کی دہائی میں حزب التحریر میں شمولیت اختیار کی اور عرب دنیا کے مختلف علاقوں میں حزب کی دعوت کے سلسلہ میں متحرک رہے۔ آپ کو حزب التحریر کے بانی اور پہلے امیر شیخ تقی الدین النبہانی (رحمۃ اللہ علیہ) اور 1977 میں شیخ تقی الدین کی وفات کے بعد حزب کے دوسرے امیر شیخ عبدالقدیم زلوم (رحمۃ اللہ علیہ) کی قربت حاصل رہی۔ 1980 میں شیخ عطا کا شمار اردن میں حزب کے چوٹی کے ممبران میں ہوتا تھا اور اِسی سال آپ کو حزب التحریر کا ترجمان مقرر کیا گیا۔

13 اپریل 2003 میں شیخ عبدالقدیم زلوم (رحمۃ اللہ علیہ) کی وفات کے بعد شیخ عطا حزب التحریر کے مرکزی امیر بنے۔ حزب کی امارت سنبھالنے سے اب تک شیخ عطا نے پاکستان، انڈونیشیا، یمن اور سوڈان سمیت دنیا کے کئی ممالک میں حزب التحریر کی منعقدہ کانفرنسوں سے خطاب کیا ہے۔

اِس کتاب کے علاوہ آپ کی دیگر تصانیف میں سے چند کتب کے نام یہ ہیں: ''تیسیر فی اصول التفسیر سورة البقره'' (2007) اور ''تیسیر الوصول من الاصول''۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عربی زبان میں اصطلاح ''بحران(Crisis)'' کے لغوی معنی'' دشواری (Hardship)'' ہوتے ہیں۔ چنانچہ اِس موضوع کے مطابق اِس کے معنی یوں بنتے ہیں کہ ایک ایسا مسئلہ جسے تمام کوششوں کے باوجود حل کرنا مشکل ہو۔ جبکہ اصطلاح ''اقتصادیات (Economy)'' کے لغوی معنی''القصد''یعنی سیدھے راستے کے ہیں۔ جبکہ یہ اصطلاح بچت کے معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے جو کہ فضول خرچی کی ضد ہے۔ اصل میں اقتصادیات (Economy) کا لفظ ایک یونانی اصطلاح سے ماخوذ ہےجس کے معنی ہیں کہ گھر کے امور کی دیکھ بھال کرنا یعنی گھر کے صاحبِ صلاحیت افراد مل کر گھر کے سازوسامان اور سہولیات کا بندوبست کرتے ہیں، جبکہ تمام افراد مل کر اُسے استعمال کرتے ہیں۔ تاہم لوگوں نے یہاں گھر کے معنی سے مراد ایک ایسا معاشرہ لیا ہے جو کہ ایک ریاست کے ذریعے چلایا جاتا ہے۔

چنانچہ یہاں اقتصادیات کے لغوی معنی کی بجائے اُس کے اصطلاحی معنی لیے گئے ہیں جس کا مطلب اموال (funds) کے امور کی دیکھ بھال ہےخواہ معاملہ اِن اموال میں اضافے اوران اموال کی پیداوار کو یقینی بنانے کا ہو،جس پر بحث اکنامک سائنس میں کی جاتی ہے یا پھر یہ معاملہ اموال کی تقسیم کے انداز کا ہو، جسے اقتصادی نظام(Economic System) میں شمار کیا جاتا ہے۔

چنانچہ اقتصادی بحران ریاست کے مالیاتی امور میں سنگین مسئلے کو کہتے ہیں جس پر قابو پانے اور حالات کو معمول پر لانے اور توازن کو بحال کرنے کے لیے حددرجہ کوشش درکار ہوتی ہے۔ جبکہ مالیاتی امور میں معمولی سی اونچ نیچ ،جنہیں معمول کے طریقوں سے حل کیا جا سکے،کو اقتصادی بحران نہیں کہا جاتا۔ کیونکہ ایسے عدم توازن تو ویسے بھی معمولاتِ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں اور

اگر یہ قابلِ قبول حدوں کے اندر رہوں تو اِن پر قابو پانا اور انہیں برداشت کرنا آسان ہوتا ہے۔

ایک نظریاتی (Ideological) ریاست، جو کہ زندگی کے بارے میں ایک مخصوص نقطہ نظر رکھتی ہو، کو یہ قبول نہیں ہوتا کہ وہ مالیاتی امور میں معمولی اونچ نیچ کو بھی نظرانداز کرے، کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں یہ معمولی عدم توازن ایک سنگین بحران کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایک نظریاتی ریاست ابتدائی مراحل میں ہی اس عدم توازن کو حل کرنے کے لیے اقدامات کرتی ہے تاکہ مسئلہ باآسانی حل ہو جائے۔

چونکہ ہم جانتے ہیں کہ اقتصادی بحران ریاست کے مالیاتی امور میں ایک سنگین مسئلے کو کہتے ہیں لہٰذا ہمیں یہ سمجھنا اشد ضروری ہے کہ کوئی بھی ریاست اپنے مالیاتی امور چلاتی کِس طرح ہے۔ یہ جاننے کے بعد ہم بحرانوں کے جنم لینے کے امکانات کی وجوہات کو بیان کریں گے اور پھر ہم اُن کے حل پر بات کریں گے۔ اس تمام کی سمجھ کے لیے دو عوامل کا سمجھنا بہت ضروری ہے کہ جو ریاست کی اقتصادی صورتِ حال پر بڑے طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں، یہ عوامل مندرجہ ذیل ہیں:

- خرید وفروخت کے لیے رائج سکہ یعنی کرنسی
- ادائیگیوں کا توازن (The balance of payments)

اوّل: کرنسی (Currency):

پچھلی صدیوں میں خرید وفروخت کے لیے استعمال ہونے والی کرنسی دھاتوں (Metallic Standard) پر مشتمل ہوتی تھی، یعنی کرنسی سے مراد ایک قیمتی دھات کا ٹکڑا ہوتا تھا، جسے حکومت سکّوں کی شکل میں جاری کرتی تھی اور یہ سکے تمام تجارتی لین دین میں استعمال ہوتے تھے۔

اِن ادوار میں کرنسی کے طور پر استعمال ہونے والی مشہور دھاتیں سونا اور چاندی تھیں، تاہم انیسوی صدی کے آخر میں چاندی کا کرنسی کے طور پر استعمال تقریباً ختم ہو گیا اور صرف سونا ہی کرنسی کے طور پر رہ گیا۔ سونا ہی کرنسی کی بنیاد بنا رہا حتیٰ کہ جب انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں کاغذی نوٹ بھی جاری ہوئے تو وہ حقیقتاً سونے کی بنیاد پر جاری ہوئے تھے یعنی اُن نوٹوں کو جب چاہے واپس کر کے متعین مقدار میں سونا مل سکتا تھا۔

گولڈ سٹینڈرڈ (Gold Standard) پر مبنی اِن کاغذی نوٹوں کے ذریعے لین دین کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم سے تھوڑا پہلے جنگ میں شامل ممالک سونے کی بنیاد کو معطل کرنے پر مجبور ہو گئے اور جنگی حالات کی وجہ سے ایسے کاغذی نوٹ جاری کر دیئے گئے جنہیں سونے کے بدلے تبدیل کرنے کی ذمے داری سے سنٹرل بنک بری الذمہ تھے۔

جنگ کے خاتمے پر اِن ممالک نے 1922ء میں جنیوا میں ایک کانفرنس منعقد کی اور کچھ تبدیلیوں کے ساتھ گولڈ سٹینڈرڈ پر واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے کرنسی کو سونے کے ساتھ وابستہ تو کر دیا لیکن لوگوں کے لیے اس بات کو مشکل بنا دیا گیا کہ وہ کاغذی نوٹوں (securities i.e representative bank notes) کے بدلے سونا حاصل کر سکیں ماسوائے کہ وہ کرنسی نوٹوں کے بدلے سونے کی ایک مخصوص مقدار حاصل کر سکتے تھے۔ یعنی اگر کوئی سنٹرل بنک سے نوٹوں کے بدلے سونا حاصل کرنا چاہتا تو یہ صرف اُن لوگوں کے لیے ممکن تھا جو سونے کے ایک مخصوص وزن کی قیمت کے برابر نوٹ دے سکتے ہوں۔ لہٰذا بنکوں نے سونے کے ذخائر اُس مخصوص کم از کم (Minimum) حد کے وزن کے ٹکڑوں (Bullion) کی شکل میں رکھنا شروع کر دیئے۔ مثال کے طور پر فرانس میں یہ حد 12 کلو سونا تھی جو اُس وقت 215,000 فرانکس کے برابر تھا، اور یہ اُس زمانے کے لحاظ سے ایک بہت بڑی قیمت تھی! اِس فیصلے کے نتیجے میں عام لوگ نوٹوں کے بدلے بنک سے سونا حاصل کرنے کے قابل نہیں رہے اور سونا صرف بیرونِ ملک تجارت کے لیے ہی ہو کر رہ گیا یا پھر اُن کے لیے جو بہت زیادہ امیر تھے۔

تاہم سونے کی بنیاد(Gold Standard) پر واپس آنے کی یہ کوشش زیادہ عرصہ نہ چل سکی کیونکہ 1929ء میں ایک زبردست عالمی بحران نے جنم لیا، سٹاک مارکیٹیں گرنا شروع ہو گئیں اور تمام سرمایہ کاروں نے خوف کے مارے اپنے شیئرز بیچنے شروع کر دیے۔ نتیجتاً بنک نوٹوں کی طلب میں بہت اضافہ ہو گیا جس سے کاغذی نوٹوں کو سونے میں تبدیل کرنے کی زبردست ڈیمانڈ پیدا ہو گئی۔ اِس مسئلے کو دیکھتے ہوئے تمام ممالک نے نوٹوں کے بدلے سونا واپس کرنے کا طریقہ معطل کر دیا اور نوٹوں کو سونے سے تبدیل کرنے کی سہولت کے بغیر ہی ضروری لین دین کرنے کی اجازت دے دی۔ اِس پالیسی پر عمل کرنے والا پہلا ملک برطانیہ تھا جس نے 1931 میں یہ فیصلہ لیا جس کے بعد امریکہ نے 1933 میں، فرانس نے 1935 میں اور پھر باقی ممالک نے بھی یہی پالیسی اپنا لی۔ مالیاتی لین دین جنگ عظیم دوئم کے خاتمے تک مسئلے مسائل سے دوچار ہوتا رہا، یہاں تک کہ 22 جولائی 1944ء میں جنگِ عظیم دوئم کے خاتمے پر کئی ممالک نے امریکہ میں بریٹن ووڈز کانفرنس(Bretton Woods Conference) منعقد کی اور دوبارہ سونے کے کرنسی سے تعلق قائم کرنے پر اتفاق کیا لیکن اِس مرتبہ بھی ماضی کے مقابلے میں مختلف انداز اختیار کیا گیا۔ اِس کانفرنس میں طے کیے جانے والے نمایاں فیصلے یہ تھے:

1) کانفرنس میں شریک تمام ممبر ممالک دوبارہ اپنی کرنسی کا تعلق سونے سے قائم کریں گے اور ہر ملک اپنی کرنسی یونٹ کے لیے سونے کا ایک خاص وزن مقرر کرے گا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ کسی فرد یا کسی تنظیم کو نوٹوں کو واپس کر کے سنٹرل بنک سے سونا حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ تاہم سونے کی جگہ اکیلے ڈالر کو عالمی سطح پر غیر ملکی زرِ مبادلہ(global foreign reserve) کی حیثیت دے دی گئی جس کی مندرجہ ذیل دو وجوہات تھیں:

الف) جنگ عظیم دوئم کے بعد دنیا میں 38 ارب ڈالر کے برابر سونے کے ذخائر تھے جس میں سے صرف امریکہ کے پاس اکیلے 25 ارب ڈالر کی قیمت کا سونا تھا جو کہ تمام ذخائر کا تقریباً دو تہائی حصہ تھا۔

ب) امریکہ اِس جستجو میں تھا کہ دنیا پر اپنا سیاسی اور اقتصادی اثر ورسوخ مضبوط کرے۔ چنانچہ اب چونکہ تمام ممالک نوٹوں کے بدلے سونا تبدیل کرنے کے ذمے دار نہیں تھے لہٰذا اُنہیں نوٹوں کی مالیت کے سونے کے ذخائر رکھنا بھی ضروری نہیں تھا بلکہ اب وہ اپنے ذخائر کو سونے کی بجائے امریکہ کے چھاپے ہوئے (بینک) نوٹ یعنی ڈالرز میں رکھا کریں گے۔ اور یہ سب اِس یقین دہانی پر کیا گیا کہ امریکہ اِس بات کا پابند تھا کہ جب بھی کوئی ملک ڈالرز کے عوض سونا حاصل کرنا چاہے تو امریکہ کی ذمہ داری تھی کہ اُس ملک کو اُن ڈالرز کے برابر سونا واپس کرے۔ مزید برآں، اس نظام نے دنیا کے ممالک پر لازم کردیا کہ اگر وہ ڈالر اور سونا کے تبادلے کو مستحکم رکھنا چاہتے ہیں تو وہ امریکہ کے ساتھ مثبت اقتصادی اور سیاسی تعلقات برقرار رکھیں۔ اور اُس زمانے میں امریکہ نے سرکاری سطح پر سونے اور ڈالر کے باہمی تبادلے کے جو ریٹ مقرر کئے تھے وہ 35 ڈالر فی اونس سونا تھے۔

بریٹن وُوڈز معاہدے کے نتیجہ میں بننے والا کرنسی کا یہ نظام سونے کی بنیاد (Gold Standard) پر چلنے والی کرنسی کے نظام کی ہی ایک شکل تھی کیونکہ بہرحال تمام ممالک کو یہ اجازت تھی کہ وہ جب چاہیں بنک نوٹ خصوصاً ڈالرز کے بدلے سونا حاصل کرلیں اور امریکہ کی طرف سے ڈالر اور سونے کے درمیان ریٹس بھی مقرر تھے۔ برطانیہ کے سٹرلنگ (Sterling) کا بھی کسی حد تک یہی معاملہ تھا یعنی سٹرلنگ بھی سونے کے عوض قابلِ تبدیل تھا لیکن یہ نظام زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔

2) بریٹن ووڈز معاہدے میں یہ بات بھی طے ہوئی تھی کہ تمام ممبر ممالک طے کردہ پالیسیوں کے مطابق اپنے اپنے کرنسی ایکسچینج ریٹس (کرنسی کی خرید وفروخت کی شرح) مقرر کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ اِس کرنسی ریٹ کو مستحکم رکھنے کے لیے اپنے پاس سونے اور ڈالرز کا ذخیرہ رکھیں گے، اور ڈالرز کے بدلے سونا حاصل کرنا ممکن ہوگا۔ معاہدے میں یہ بھی شامل تھا کہ کرنسی کے ایکسچینج ریٹ میں ایک فیصد کی اونچ نیچ کی گنجائش ہے لیکن اگر یہ اونچ نیچ ایک فیصد سے زیادہ ہو، تو ریاستیں اپنے اقتصادی نظام میں مداخلت کرکے اسے صحیح ریٹ پر واپس لائیں گی۔

3) بریٹن وُوڈز کانفرنس نے دو نئے عالمی ادارے بھی قائم کیئے:

الف) IMF (عالمی مالیاتی فنڈ)، جس کا بنیادی مقصد عالمی مالیاتی نظام اور کرنسی کی خرید وفروخت کی شرح میں استحکام رکھنے کے ساتھ ساتھ ممبر ممالک کے لیے مالی وسائل فراہم کرنا تھا تا کہ اُن ممالک کی ادائیگیوں میں عدم توازن کی مدت کو کم سے کم کیا جا سکے۔ وسائل کی یہ فراہمی اُسی تناسب سے ہوگی جتنا اُس ملک کا اِس ادارے کے اندر حصہ ہوگا۔

IMF میں فیصلہ سازی کو اِس طرح سے ترتیب دیا گیا کہ جس میں امریکہ کی IMF کے فیصلوں پر بالادستی یقینی بن گئی، کیونکہ IMF میں ہر ملک کو فیصلوں میں اُتنے ہی ووٹ حاصل تھے جتنا اُس ملک کا فنڈ میں مالی حصہ (شئیر) تھا۔ اور چونکہ امریکہ کا اِس فنڈ میں سب سے بڑا حصہ تھا یعنی کل مالیاتی فنڈ کے 27.2 فیصد حصے کے برابر، لہٰذا امریکہ کو IMF کے تمام فیصلوں میں بالادستی اور عملاً ویٹو پاور حاصل ہوگئی۔

ب) دوسرا ادارہ جو قائم کیا گیا وہ ''ورلڈ بنک برائے تعمیرِ نو اور ترقی'' تھا اور اِس کی رکنیت صرف اُن ممالک کے لیے مختص تھی جو IMF کے ممبر تھے۔ اِس ادارے کا مقصد جنگ سے ہونے والی تباہی کی تعمیرِ نو اور ترقی پذیر ممالک کی مدد کرنا تھا، جس میں قرضوں اور گرانٹس کی فراہمی بھی شامل تھی۔ اور اس ادارے میں بھی ووٹنگ کے حقوق IMF جیسے ہی تھے جس سے امریکہ کو اِس ادارے پر بھی بالادستی حاصل ہوگئی۔

یہ تھے بریٹن ووڈز کانفرنس کے اہم فیصلے، جس نے سونے کے تبادلے کے نظام کو اپنایا۔ اس میں طے کردہ نکات پر عمل درآمد ہوتا رہا یہاں تک کہ 15 اگست 1971 کو امریکہ نے اپنے بدنامِ زمانہ فیصلے کے ذریعے عملاً اس معاہدے کو غیر موثر کر دیا اور امریکہ ڈالر کے عوض سونا دینے کے اقرار سے پھر گیا۔

امریکہ کے اِس فیصلے کے بعد کرنسی نے محض علامتی شکل اختیار کر لی اور اُس وقت سے

کرنسی کی تعریف (Definition) یہ بن گئی کہ کوئی بھی ایسی چیز (نوٹ اور سکے وغیرہ) جسے قانونی طور پر عوامی تجارتی لین دین کی بنیاد بنانے کی حیثیت دی جائے، چاہے وہ کسی بھی شکل یا ہیت کی ہو۔ چنانچہ کاغذی (Fiat) بینک نوٹ جاری کرنا شروع کیے گئے اور اِن کے قانونی طور پر موثر ہونے کا انحصار ہر ملک کے اپنے ملکی قوانین پر تھا۔ لہٰذا اب ہر ملک کی کرنسی کی قدر جن بنیادوں پر بڑھتی یا کم ہوتی تھی وہ اُس ملک کی اقتصادی صورتحال، اُس کے اقتصادی قوانین، اُن قوانین سے نکلنے والی پالیسیاں جیسے تجارتی توازن کی دیکھ بھال، ادائیگیوں میں توازن کی حیثیت اور اِس جیسے دیگر امور تھے۔

دوم: ادائیگیوں کا توازن (Balance of Payments)

ادائیگیوں کا توازن (Balance of Payments) ایک ملک کے دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ ایک متعین مدت میں ہونے والے ہر طرح کے مالیاتی لین دین کا جامع حساب کتاب ہے، اس بات سے قطع نظر کہ اس کاروباری لین دین کی نوعیت کیا ہے۔ اِس توازن کے دو پہلو ہوتے ہیں:

پہلا پہلو آمدن (Revenues) کا ہوتا ہے جو (موجودہ اقتصادی نظاموں کے مطابق) اِن چیزوں پر مشتمل ہے:

1: تمام ظاہری (visible) برآمدات (یعنی دوسرے ممالک کو برآمد کیا جانے والا تمام تر سامان)

2: تمام غیر محسوسہ (invisible) برآمدات (یعنی اس میں ملک میں موجود غیر ملکی رہائشیوں یا سیاحوں کو دی گئی سہولیات اور تجارت سے، بیرونی ممالک کے سفارتی محکموں کی خریداری کی وجہ سے حاصل ہونے والی آمدن، غیر ملکیوں کے وہ سفارتی اور تجارتی اخراجات جو ملک میں موجود کمپنیوں کے ذریعے کیے گئے ہوں، فلموں اور مواصلاتی سہولیات سے حاصل ہونے والی آمدن، کوئی انتظامی یا تکنیکی انعام، لوکل کمپنیوں میں کام کرنے والے غیر ملکیوں سے حاصل ہونے والی

انشورنس کی قسطیں، غیر ملکی کمپنیوں سے ملنے والے معاوضے، غیر ملکی طلبہ کا اس ملک میں پیسے خرچ کرنا اور اِسی طرح کی دیگر آمدنی شامل ہے)

3: بیرونی قرضہ جات یعنی وہ جو دوسرے ممالک اُس ملک کو دیں۔

4: بیرونی ممالک کو دیئے گئے قرضوں پر حاصل ہونے والے سود، منافع یا پھر اقساط۔

5: دوسرے ممالک یا اُن کے شہریوں کی طرف سے اس ملک یا اس کے شہریوں کو ملنے والے عطیات یا تحائف۔

دوسرا پہلو ادائیگیوں (payments) کا ہوتا ہے جس میں یہ شامل ہیں:

1: تمام ظاہری درآمدات (یعنی دوسرے ممالک سے درآمد کی جانے والی اشیاء)

2: تمام غیر محسوسہ درآمدات (یعنی وہ تمام اخراجات جو اِس ملک کے باشندے دوسرے ملک میں سیاح کے طور پر یا پھر عارضی طور پر بیرونِ ملک رہتے ہوئے خدمات کے حصول یا اشیاء کی خریداری پر کریں، دوسرے ممالک کی کمپنیوں سے سفر اور سامان کی نقل و حرکت کی سہولیات حاصل کرنے پر اٹھنے والا خرچ، بیرونی یونیورسٹیوں اور اداروں میں پڑھنے والے طلباء کے اخراجات، سفارت خانے کے عملے کی طرف سے غیر ملکیوں سے حاصل کی جانے والی خدمات اور اشیاء کی خرید پر آنے والا خرچ، غیر ملکی کمپنیوں کو دی جانے والی انشورنش کی قسطیں، معاوضے اور تحائف، دیگر ممالک کی فلمی اور مواصلاتی سہولیات کو استعمال کرنے کے اخراجات اور اِس جیسے دیگر اخراجات شامل ہیں)

3: وہ قرضے جو غیر ملکی اداروں یا دوسرے ممالک کو اس ملک نے واپس کرنے ہیں۔

4: سود یا منافع جو دوسرے ممالک کو واپس کرنا ہے۔

5: کوئی امداد یا گرانٹ جو بیرونِ ملک بجھوانی ہے۔

ادائیگیوں کے توازن(The balance of payments) سے ایک ملک کا باقی ممالک کے درمیان پیسوں کے تبادلے کی تفصیلات کو دیکھا جاسکتا ہے، لیکن اِس سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ ریاست کی ملکیت میں کل اثاثے کیا ہیں یا وہ دیگر ممالک کی کتنی مقروض ہے۔

ایک سال میں ہونے والی تمام ظاہری(visible) برآمدات اور درآمدات کے توازن کو تجارتی توازن(Balance of trade) کہا جاتا ہے جبکہ تمام ظاہری اور غیر ظاہری برآمدات اور درآمدات کو ادائیگیوں کے توازن کے اندر Operational Transaction کہا جاتا ہے۔

بہر حال، تجارتی توازن(Trade Balance) یعنی برآمد اور درآمد شدہ اشیاء، ہی سب سے اہم حصہ ہوتا ہے اور اکثر اوقات یہ مجموعی توازن کے تقریباً دو تہائی حصے کی نمائندگی کرتا ہے۔ تاہم ادائیگیوں کا توازن(Balance of payments) تجارتی توازن (Trade Balance) کو واضح نہیں کرتا، کیونکہ ادائیگیوں کے توازن میں اور بھی بہت سی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر جرمنی کا 1925ء میں ادائیگیوں کا توازن برابر تھا لیکن اِس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ برآمدات درآمدات کے برابر یا زیادہ تھیں بلکہ وجہ یہ تھی کہ اُس عرصے میں جرمنی کو درجنوں قرضے ملے تھے جن کی کل قیمت تقریباً 90 کڑور مارکس تھی۔ اِسی طرح 1929ء میں امریکہ کی ادائیگیوں کا توازن خسارے میں تھا لیکن اِس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُس کا تجارتی توازن(Trade Balance) خسارے میں تھا، بلکہ وجہ یہ تھی کہ اُس نے بیرونی ممالک میں بہت زیادہ سرمایہ کاری کی تھی۔ اِن مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ادائیگیوں کے توازن میں برابری لانے کی خاطر برآمدات کے بڑھانے، قرضہ لینے یا سرمایہ کاری جیسے فیصلے لینے سے قبل اِس سے متعلقہ تمام پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

کرنسی اور ادائیگیوں کے توازن(Balance of payments) کی حقیقت کو سمجھنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اقتصادی بحران(Economic Crisis) کا اِن دونوں کی

وجہ سے آنا عین ممکن ہے کیونکہ:

1: کرنسی کی حقیقت سے پیدا ہونے والا اقتصادی بحران:

جب دنیا سونے کے پیمانے(Gold Standard) پر جاری کردہ کرنسی کے ذریعے لین دین کررہی تھی تو وہ اقتصادی لحاظ سے ایک خوش حال اور مستحکم دَور دیکھ رہی تھی۔ لیکن جب اِس بنیاد کو ختم کر کے اِس کی جگہ ایسی کاغذی کرنسی کا نظام جاری کیا گیا جس کے بدلے سونا حاصل کرنا ممکن تھا، تب سے مالیاتی امور میں اونچ نیچ نمایاں ہونے لگیں، اِس حد تک کہ اقتصادی استحکام ختم ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد بالآخر وہ دور آ گیا جب کرنسی نوٹ محض کاغذ کے ٹکڑے تھے اور اِن کے بدلے سونا حاصل کرنا ناممکن تھا(fiat)، جس کے بعد حالات بگڑنے لگے اور ایک کے بعد دوسرا بحران جنم لینے لگا۔

سونے کی بنیاد(Gold Standard) پہ چلنے والے نظام کی خاصیت یہ تھی کہ یہ مختلف کرنسیوں کے درمیان تبادلے کی شرح کو مستحکم رکھتا تھا، کیونکہ ہر ملک کی کرنسی یا تو خود سونا تھی یا ایسے نوٹ تھے جو سونے کی ایک متعین مقدار کی بنیاد پر تھے اور کسی بھی وقت اُن کو واپس کر کے پورا سونا حاصل کرنا ممکن تھا۔ مثال کے طور پر اسلام میں دینار کا وزن 4.25 گرام سونے کے برابر مختص ہے، جبکہ برطانوی پاؤنڈ کا وزن قانوناً 2 گرام خالص سونا اور فرانسیسی فرانک 1 گرام سونے کے برابر مختص تھا۔ اِسی لیے شرح تبادلہ متعین(fix) تھا۔

سونے کو بنیاد بنانے سے نہ صرف اندرونِ ملک مالیاتی اکائی(Monetary Unit) مستحکم رہتی بلکہ بیرونِ ملک بھی اِسے استحکام ملتا۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ 1910 میں سونے کی قیمتیں تقریباً وہی تھیں جو 1890 میں تھیں۔

تاہم جب سونے کے نظام کو منسوخ کیا گیا تو بحران کے سلسلوں نے اِن وجوہات کی بنیاد پر شدت اختیار کی:

اوّل: سونے کے تبادلے کے نظام کا بحران:

اِس نظام میں مرکزی بینکوں نے سونے کے ساتھ ساتھ ڈالرز کو بھی ذخائر (Reserves) کے طور پر شامل کر دیا تھا اور بریٹن ووڈز (Bretton Woods) معاہدے کے تحت اِس بات کی ضمانت حاصل تھی کہ 35 ڈالرز کے عوض ایک اونس سونا ملے گا۔

چنانچہ اِس نظام کے تحت تمام ممالک امریکہ کے رحم وکرم پر تھے کیونکہ اب امریکہ اپنے ادائیگیوں کے توازن (Balance of payments) میں خسارے کو جب چاہتا ڈالر چھاپ کر پورا کر دیتا، چاہے اُس کے پاس اُتنا ہی سونا ہو یا نا ہو۔ نتیجتاً جتنے زیادہ ڈالر چھپتے گئے اُتنا ہی ڈالرز کے عوض سونا حاصل کرنا مشکل ہوتا گیا، اور دوسری جنگ عظیم اور مارشل منصوبے (Marshall Plan) کے اختتام پر یہی ہوا۔ اِس وجہ سے امریکہ نے اندرونِ ملک ڈالر کے بدلے سونا حاصل کرنے پر پابندی لگا دی اور صرف بیرونِ ملک دیئے گئے ڈالرز پر یہ اجازت رکھی کہ وہ ڈالرز کے بدلے سونا حاصل کر سکتے ہیں۔ یوں بحران ٹل گیا کیونکہ امریکہ کے پاس جو سونا تھا وہ بیرونی ممالک کو دیئے گئے ڈالرز کے لیے کافی تھا جب کہ اندرونِ ملک پائے جانے والے ڈالرز کے لیے ناکافی تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سونے کے ذخائر مزید کم ہوتے گئے یہاں تک کہ 1960ء میں ایک اور بحران آ گیا جو 1965ء تک مزید بگڑ گیا جب بریٹن وُوڈ معاہدے میں طے کئے گئے 35 ڈالرز فی اونس کی شرح کے لحاظ سے امریکہ کے سونے کے ذخائر بیرونِ ملک ڈالرز کے بھی برابر نہ رہے۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ مختلف ممالک کے خزانوں میں موجود ڈالرز کے ذخائر کی حقیقی قدر مقرر کردہ قدر سے کہیں کم تھی، جس کا مطلب صاف طور پر مزید اقتصادی عدم استحکام کی طرف پیش قدمی تھا۔

بیرونِ ملک ڈالرز کی تعداد بڑھانے کی وجہ سے صرف جنوری 1958ء اور دسمبر 1960ء کے درمیانی عرصے میں امریکہ کے چار ارب ڈالر کے برابر سونے کے ذخائر کم ہوگئے۔ جس کے نتیجے میں ڈالر پر اعتماد کم ہو گیا اور سونے کی طلب اور اُس کی ذخیرہ اندوزی بڑھ

گئی۔ دوسری طرف بینکوں سے ڈالرز کے عوض سونا حاصل کرنے کی مانگ بھی بڑھ گئی اور ساتھ ہی ساتھ بہت سے ممالک نے اپنے ادائیگیوں کا توازن (Balance of payments) بھی بغیر سونے کے بغیر صرف ڈالروں میں پورا کرنا شروع کر دیا۔ نیچے دیئے گئے ٹیبل سے ڈالر کی پشت پر سونے کی موجودگی (gold cover for dollar) میں کمی کی ایک جھلک ملتی ہے: (اعداد و شمار ارب ڈالرز میں ہیں)

سال:	1946	1949	1957	1960	1965
امریکہ میں سونے کے ذخائر:	20.6	24.5	22.8	18.8	14
بیرونِ ملک ڈالرز کے ذخائر: (سرکاری اور نجی)	1.6	6.4	14.6	18.7	25.2

اس صورتِ حال کے باعث امریکہ نے دوسرے کلیدی ممالک سے امداد طلب کی، جس پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ سونے کا ایک کمپلیکس (Gold Complex) قائم کیا جائے جس کا کام اُس صورت میں ہوگا کہ جب مارکیٹ کی وجوہات کی بنا پر سونے کی قیمتیں چڑھ جائیں تو بنک فوراً مداخلت کرتے ہوئے زائد سونے کی فروخت شروع کر دیں تاکہ قیمتیں دوبارہ مطلوبہ سطح پر واپس آجائیں اور اگر سونے کی قیمتیں گر جائیں تو بنک زائد سونے کو جلدی سے خرید لیں تاکہ قیمتیں واپس صحیح سطح پر آجائیں۔ یہ کمپلیکس چند سالوں تک خصوصاً 1965 سے لے کر 17 مارچ 1968 تک سونے کی سپلائی کے ذریعے مارکیٹ کے معاملات میں مداخلت کرتا رہا جس کی وجہ سے ممبر ممالک کے سونے کے ذخائر (Gold Reserves) کو سنگین خطرہ لاحق ہوگیا۔ چنانچہ اِس خطرے کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے فرانس جون 1967ء میں اِس منصوبے سے علیحدہ ہوگیا۔ اور اِس کے فوراً بعد 1967 کے خزاں کے موسم میں سٹرلنگ بحران نے جنم لیا اور 1968ء میں سونے کا بحران پیدا ہوگیا۔ اِن دونوں بحرانوں کی وجہ سے ممبر ممالک نے 6 مہینوں میں 2.5 ارب ڈالر کی قیمت کا سونا کھو دیا۔ آخر کار 17 مارچ 1968 میں واشنگٹن میں ممبر ممالک کی ملاقات ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب کمپلیکس کا منصوبہ ختم کر دیا جائے اور سونے

کی قیمت کو مارکیٹ میں سپلائی اور ڈیمانڈ کے قائدے پر چھوڑ دیا جائے۔

مندرجہ بالا بیان کردہ سونے کے اِس بحران کے نتیجے میں امریکہ کے سونے کے ذخائر 1965 میں 14 ارب سے گر کر مارچ 1968 میں، جب گولڈ کمپلیکس کے منصوبے کو ختم کیا گیا، 10.48 ارب رہ گئے۔ یہ 10.48 ارب ڈالر کا سونا اُس زمانے کے 25 فیصد ڈالرز کے برابر تھا اور اُس وقت قانوناً ریاست کے پاس کم از کم ڈالرز کے 25 فیصد کے برابر سونا ہونا لازمی تھا۔ لہٰذا امریکہ نے تمام بیرونی نجی اداروں کے ڈالر کے بدلے سونا حاصل کرنے پر پابندی لگادی، اور صرف سرکاری سطح پر ڈالروں کے تبادلے کی اجازت رکھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اندرونِ ملک سونے کے حصول کے سسٹم کا خاتمہ ہوگیا۔ تاہم امریکہ کے سونے کے ذخائر بیرونی سرکاری ڈالرز کے بدل سے بھی کم ہوگئے، وہ ڈالرز جو بین الاقوامی تجارت میں نجی اور سرکاری اداروں کی درآمدات و برآمدات اور پبلک سیکٹر کے لین دین کا نتیجہ تھے۔ لہٰذا امریکہ نے 1971ء میں ڈالر کے عوض سونا حاصل کرنے کے پورے نظام کو ہی ختم کردیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'سونے کے تبادلے کے نظام' کی وجہ سے کتنے سنگین بحران جنم لیتے ہیں۔ مزید برآں، یہ اِس بات کو بھی صاف ظاہر کرتا ہے کہ جس ملک کے پاس بین الاقوامی تجارت کے لیے ذخائر (Reserve) کے طور پر رکھی جانے والی کرنسی (یعنی جس سے ذخائر (Reserves) کی پیمائش ہوتی ہے) کا کنٹرول ہوگا، وہ ملک جب چاہے اضافی ڈالرز چھاپ کر عالمی مالیاتی نظام میں خلل ڈال سکتا ہے اور اِس کا تمام تر بوجھ دوسرے ممالک کے خزانوں کو برداشت کرنا پڑے گا کہ وہ توازن کو دوبارا بحال کریں۔ یعنی دیگر ممالک کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ ڈالر چھاپنے والے ملک کی ادائیگیوں کے توازن (Balance of payments) کا خسارہ پورا کریں۔ اِس کے علاوہ یہ خطرہ اپنی جگہ موجود تھا کہ ڈالر چھاپنے والا ملک جب چاہے ڈالروں کے بدلے سونا حاصل کرنے کو مکمل طور پر پابندی لگادے یا اُن پر شرائط عائد کردے۔ اِس کے نتیجے میں ڈالر کی قدر گرنے سے دیگر ممالک کے ڈالر کے ذخائر نہایت نچلے درجے پر پہنچ گئے، جس نے اُن کے اقتصادی منصوبوں کو متاثر کیا۔ اُس وقت کے فرانسیسی صدر De

Gaulle نے اِس خطرے کو سمجھتے ہوئے اپنی 14 فروری 1965 کی مشہور تقریر میں کہا تھا کہ ڈالر کی پشت پر پہلے سونا تھا، لیکن اب ڈالر کی پشت پر سونا صرف 20 فیصد موجود ہے، اگر اِس وقت تمام ممالک اپنے ڈالروں کے عوض سونا حاصل کرنا چاہیں تو امریکہ کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں کہ وہ سرکاری شرح پر یہ تبادلہ کرے کیونکہ امریکہ کے پاس اتنا سونا ہی نہیں۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ موجودہ نظام کو خالص سونے پر مبنی (Gold Standard) کرنسی والے نظام سے تبدیل کیا جائے۔

اِس لیے سونے کے تبادلے والے نظام (Gold exchange system) میں مالیاتی بحرانوں کا پیدا ہونا عین ممکن ہے، کیونکہ تمام ممالک سونے کے مقابلے میں ڈالر کی قدر کو برقرار رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں اور انہیں ڈالر اور سونے کے تناسب کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے مرکزی بینکوں کے سونے کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ بحران اُس وقت اور شدت اختیار کرتا ہے جب ڈالر چھاپنے والا ملک ڈالرز کی پشت سے سونے کی بنیاد کو ہٹا دے، جس کی وجہ سے تمام ممالک کے ذخائر اپنی قدر کھو دیتے ہیں، جس سے ہر ملک کی اپنی کرنسی اگر زیادہ نہیں تو کم از کم ڈالر کی قدر میں کمی کے برابر اپنی قدر کھو دیتی ہے۔

دوم: Fiat Banknotes کے نظام کے نتیجے میں آنے والے بحران:

Fiat بینک نوٹ (یعنی ایسے کاغذی نوٹ جو محض کاغذ کے ٹکڑے ہوں جو حکومت کی طرف سے جاری کیے جائیں اور اُن کی پشت پر سونا وغیرہ نہ ہو) کا نظام بحرانوں میں مزید اضافہ کر دیتا ہے، کیونکہ مختلف ریاستیں آپس میں سیاسی اور اقتصادی میدان میں مقابلہ کرتی ہیں، اسی طرح نجی مارکیٹوں میں ہونے والی قیاس آرائیاں (Speculation)، ریاستوں کی طرف سے درآمدات اور برآمدات کی ضرورت، ریاستوں کی قرضوں کی ضرورت، یہ اور اِس طرح کے دیگر امور کرنسی کی قدر کے اتار چڑھاؤ پر بڑے طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ نتیجتاً قیمتوں اور تجارتی لین دین میں استحکام ختم نہ بھی ہو تو کم از کم ایک اجنبی چیز ضرور بن جاتا ہے جیسا کہ ہم آج

کل کے داخلی اور عالمی اقتصادی لین دین میں دیکھ رہے ہیں۔

اِس نظام میں تمام ممالک اپنے کرنسی کے ذخائر (reserves) ان ممالک کی کرنسی کی شکل میں ذخیرہ کرنا چاہتے ہیں جو سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے اثر ورسوخ کے حامل ہوں۔ اِن مضبوط ممالک کے اندر کوئی اقتصادی یا سیاسی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اِس کا اثر براہِ راست اُن ممالک اور اُن کی اقتصادی صورتحال پر پڑتا ہے جنہوں نے ان ممالک کی کرنسی کے ذخائر رکھے ہوئے ہوں۔ تو مثال کے طور پر جو ملک اپنے ذخائر ڈالر کی شکل میں رکھ رہے ہیں وہ ہر صورت میں کوشش کریں گے کہ ڈالر مستحکم اور مضبوط رہے، تا کہ اُن کے اپنے ذخائر مضبوط رہیں، تو اگر اِس ملک کی اپنی کرنسی کی طلب بڑھتی ہے تو اُس کی قیمت ڈالر کے مقابلے میں بڑھ جائے گی، تو اِس صورتحال کو قابو میں رکھنے کے لیے ریاست اپنی کرنسی مارکیٹ میں بیچنا شروع کر دے گی تا کہ اُس کی قیمت گرے اور ڈالر کے ساتھ اس کی کرنسی کی قیمت میں استحکام رہے۔ اِس کے برعکس، اگر اس ملک کی کرنسی کی طلب کم ہو جائے تو ریاست مارکیٹ سے اپنی کرنسی خریدنا شروع کر دے گی تا کہ ڈالر اور اپنی کرنسی کے ریٹ میں استحکام رہے۔ یعنی اِس ریاست کو اپنی کرنسی کے ساتھ ساتھ ڈالر کے تحفظ کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اِس ملک نے خود اس بوجھ کو اٹھانا ہے اور یہ بوجھ اُس ملک سے زیادہ بھاری اور شدید ہے جو ڈالر چھاپتا ہے۔ اور اگر یہ ملک اپنی کرنسی کے ساتھ ساتھ خارجہ ذخائر (foreign reserves) والی کرنسی کا تحفظ نہیں کرے گا تو اُس کے اثاثوں کی قدر کم ہو جائیگی۔ اِس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

1) 72-1971 اور 73-1972 کے دوران ڈالر کی قیمت گرنے سے کویت کے مرکزی بینک کو تقریباً 7.96 کروڑ کویتی دینار کا نقصان اُٹھانا پڑا، جو کہ کویتی اثاثوں کا 18 فیصد تھا۔

2) 78-1974 کے عرصے میں اوپیک (OPEC) ممالک نے اپنے مائع مالی سرمائے (liquid financial investments) میں 61 فیصد کا خسارہ دیکھا جب اس دوران ان کی قیمت اندازاً 78 ارب ڈالر سے گر کر 47 ارب ڈالر ہو گئی۔

3) 1979-80 میں عرب ممالک کے تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی سالانہ 176 ارب ڈالر کے برابر تھی، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ڈالر کی قیمتِ خرید وفروخت میں معمولی سی اونچ نیچ بھی کتنے زیادہ اثرات پیدا کرسکتی ہے۔

4) 1976ء میں عرب ممالک کے مالیاتی ذخائر کی قیمت 35.44 ارب ڈالر کے برابر تھی جس میں سے 88 فیصد ذخیرہ بیرونی ممالک کی کرنسی کی شکل میں تھا، اور اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کرنسیوں کی قدر میں اونچ نیچ سے ذخائر کتنا زیادہ متاثر ہوسکتے ہیں۔

مزید برآں، بیرونی کرنسی میں ذخائر جمع کرنے سے ہونے والے نقصان کے ساتھ ساتھ Fiat Banknotes کے نظام کا ایک نقصان ملک کی اپنی کرنسی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ملک کی اپنی کرنسی سے پیدا ہونے والا مسئلے کا اثر اندرونِ ملک کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر بھی ہوتا ہے، اور سابقہ نظاموں کے مقابلے میں یہ نظام افراطِ زر کا مقابلہ کرنے میں کہیں زیادہ نازک ہے۔

اِس کے برعکس سونے کی کرنسی والے نظام میں اِس لیے استحکام ہوتا ہے کیونکہ اِس میں مکمل انحصار سونے پر خود ہوتا ہے۔ جبکہ گولڈ ایکسچینج سسٹم میں کہ جہاں ایک ملک کی کرنسی کا انحصار سونے پر ہواور دوسرے ممالک کی کرنسیاں اس کرنسی کے ساتھ منسلک ہوں کہ جس کی پشت پر سونا ہے اوران کرنسیوں کو دے کر سونا حاصل کیا جاسکتا ہو، تو اِس نظام میں استحکام عارضی ہوتا ہے اور یہ استحکام اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک ذخائر والی کرنسی (یعنی ڈالر) کی پشت پر سونے کے ذخائر کم نہ ہوں۔ باالفاظِ دیگر کرنسی کو اگر سونے کے عوض تبدیل کرنا ممکن نہ ہو، چاہے مکمل طور پر یا جزوی طور پر، تو اِن دونوں صورتوں میں استحکام برقرار نہیں رہے گا، اور کرنسی اپنی قیمت کھو دے گی۔

البتہ جس نظام میں سونے کی بنیاد کے بغیر چلنے والے کاغذی نوٹ ہوں (compulsory paper banknotes)، تو اس کے اندر افراطِ زر کا مسئلہ ہر

تھوڑے عرصے بعد نمودار ہوتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس نظام میں کرنسی کی قیمت کا انحصار سونے کی بجائے ملک کے اندرونی اور خارجہ اقتصادی پالیسیوں پر ہوتا ہے، اور چونکہ مختلف عوامل ان پالیسیوں پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں لہٰذا کرنسی کے ایکسچینج ریٹس میں استحکام نہیں رہتا۔ چنانچہ اِس کرنسی کی قیمتِ خرید میں کمی کے امکانات باقی دونوں نظاموں (گولڈ سسٹم اور گولڈ ایکسچینج سسٹم) سے زیادہ ہیں۔

اِس کا بہترین ثبوت خود یہ امر ہے کہ ترقی یافتہ ممالک سمیت تمام تر ممالک کی کرنسیوں کی قیمت میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، اور ڈالر، مارک، ین، فرانک، پاؤنڈ سٹرلنگ جیسی کرنسیوں کی قدر میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔

یہ بات طے ہے کہ جب افراطِ زر بڑھتا ہے تو قیمتیں بھی بڑھ جاتی ہیں کیونکہ کرنسی کی قوتِ خرید میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔ اگر قوتِ خرید میں کمی کا سلسلہ ہر کچھ عرصے بعد ہونے لگے تو یہ اقتصادی لحاظ سے بڑا خطرناک ہے۔ کیونکہ اِس نظام میں کرنسی کی پشت پر کوئی حقیقی اثاثہ نہیں ہوتا لہٰذا یہ مالیاتی نظام مختلف ممالک کے درمیان تنازعے اور ظن وتخمین کا باعث بن جاتا ہے، جہاں ایک ملک اپنی کرنسی کی قیمت گرالیتا ہے تاکہ اُس کی برآمدات میں اضافہ ہو تو دوسرا ملک اپنی کرنسی پر شرحِ سود بڑھا دیتا ہے تاکہ لوگ اپنا روپیہ پیسہ بینکوں میں جمع کرادیں۔ یہ اِس لیے کیا جاتا ہے تاکہ ملک کے شہریوں کی بچت کو ذخیرہ کیا جاسکے اور بیرونی ممالک سے سرمایہ کو کھینچا جا سکے۔

کرنسی کی قیمت میں اتار چڑھاؤ، کاروباری زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کرنسی کے اوپر شرحِ سود بڑھتا ہے یا ریاست کی اقتصادی صورتحال بہتر ہوتی ہے، تو لوگ سٹاک مارکیٹوں کی بجائے اُس کرنسی کے کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا شروع کردیتے ہیں۔ جیسا کہ اس وقت ہوا جب سوموار 19 اکتوبر 1987ء کو وال سٹریٹ کی مالیاتی مارکیٹ کریش ہوگئی۔ اور ایک دن میں شیئرز کے حصص کی قیمتیں 20 فیصد تک گر گئیں۔ ماہرین کا اِن حصص

کے گرنے کی وجہ کے اوپر اختلاف تھا لیکن غالب گمان یہ ہے کہ اس کی وجہ امریکی حکومت کا یہ خبر پھیلانا تھا کہ وہ ڈالر پر سود کی شرح میں گراں قدر اضافے کا ارادہ رکھتا ہے۔ امریکی میڈیا نے امریکی اور جرمن اختلاف کی خبر کو لیک کر دیا تھا کہ امریکی سیکرٹری برائے خزانہ نے جرمنی کے وزیر کا جرمن مارک پر سود کی شرح بڑھانے کے جواب میں ڈالر پر شرحِ سود بڑھانے کی دھمکی دی ہے۔ اِس خبر کے نتیجے میں حصص کے مالکان نے اپنے حصص بیچنا شروع کر دیئے تا کہ وہ بانڈز، ڈیپازٹس وغیرہ میں سودی سرمایہ کاری کر کے بھاری منافع کما لیں، قبل یہ کہ صورتِ حال میں تبدیلی واقع ہو جائے۔ فرانسیسی وزیرِ خزانہ کے بقول اِس بحران کی وجہ یہ تھی۔

وال سٹریٹ کے اِس بحران کے بعد مغربی ممالک کے چند وزراء خارجہ نے یہ سفارش پیش کی کہ کرنسیوں کی قیمتوں کو مخصوص اشیاء کے ساتھ مختص کر دیا جائے، جس میں سونا بھی شامل تھا۔ یہ سفارش بریٹن ووڈ معاہدے کی جانب ایک 'درست' قدم تھا۔

اِن تمام بحرانوں اور مسئلوں کے باوجود ابھی تک دنیا کھوکھلے کاغذی نوٹوں کے نظام پر ہی قائم ہے۔ اِس کی وجہ چند ممالک کا وہ فائدہ ہے جو وہ باقی کے زیادہ تر ممالک کے نقصان کے بدلے اُٹھاتے ہیں اور جس کی وجہ سے ان چند ممالک کا دیگر ممالک پر اقتصادی اور سیاسی تسلط برقرار رہتا ہے۔ یہ تسلط اِس وجہ سے قائم رہتا ہے کہ دیگر ممالک کے مرکزی بینکوں میں ذخائر اُن کرنسیوں کی شکل میں ہوتے ہیں جو یہ چند ممالک چھاپتے ہیں لہٰذا یہ چند ممالک باقی ممالک کی سیاسی اور اقتصادی صورتحال پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

وہ ممالک جو موجودہ کرنسی کے نظام سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں، حقیقت میں یہی ممالک سونے کی بنیاد پر کرنسی والے نظام پر واپس لوٹنے میں اصل رکاوٹ ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِن کے پاس خود کرنسی کے برابر کا سونا ہی نہیں کہ وہ اپنی کرنسی کی پشت پر رکھ سکیں اور ساتھ ہی ساتھ اگر دنیا میں واپس سونے کا نظام رائج ہو جائے تو 'ہارڈ کرنسی' کے حامل یہ ممالک بھی کرنسی کے معاملے میں باقی ممالک کے برابر آ کھڑے ہونگے۔ لہٰذا جب تک یہ کھوکھلے کاغذی نوٹ کا سسٹم چلتا

رہے گا دنیا اِسی طرح بحرانوں کا شکار رہے گی جب تک کہ اِس نظام کا صحیح متبادل نہ لایا جائے۔

2: ادائیگیوں کے توازن کے پہلو سے جنم لینے والے اقتصادی بحران:

ادائیگیوں کا توازن دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے (آمدنی اور اخراجات (creditor and debtor)) اور یہ توازن اُس وقت مضبوط مانا جاتا ہے جب دونوں برابر ہوں۔ تاہم اکثر اوقات ایسا نہیں ہوتا اور دنیا کے تمام ممالک میں باقاعدگی سے یہی اقتصادی صورتحال نظر آتی ہے۔

خسارے اُس وقت پائے جاتے ہیں جب اخراجات کو پورا کرنے کے لیے آمدنی ناکافی ہو۔ خسارے کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

1) حکومتی درآمدات میں اضافہ (جیسا کہ تعمیرات کے شعبے میں استعمال ہونے والی مشینیں اور آلات) اور اُنہیں پیداواری منصوبوں میں صحیح طور پر استعمال نہ کرنا۔

2) اندرونِ ملک پیداوار کے ذرائع کم یا کمزور ہونے کی وجہ سے بنیادی ضرورت کی اشیاء کو دوسرے ممالک سے درآمد کرنا۔ ایسے ممالک کو ایسی اشیاء درآمد کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور یہ ممالک غیر ضروری اشیاء بھی درآمد کر لیتے ہیں۔

3) سرمائے کی بیرونِ ملک برآمد میں اضافہ، جیسا کہ بیرونِ ملک قرضے دینا یا وہاں پر سرمایہ کاری کرنا۔

4) ایسے اخراجات جو یکطرفہ ہوں مثلاً جنگی معاوضے یا جرمانے۔

5) اُن پیداواری شعبوں کی ترویج کرنا یا ایسی سرمایہ کاری کی پالیسیاں اختیار کرنا جن کا تعلق پُرتعیش (luxuries) اشیاء کے استعمال سے ہو۔

6) اندرونِ ملک سیاسی اور اقتصادی حالات کی خرابی کی وجہ سے سرمائے کی بیرونِ ملک منتقلی۔

7) سرکاری سطح پر یا عوامی اداروں میں انتظامی کرپشن اور اس کرپشن سے پیدا ہونے والے ماحول کی وجہ سے عوام کی تشویش اور ان کا اعتماد اُٹھ جانا جس کے نتیجے میں وہ اپنا سرمایہ بیرونِ ملک اکاؤنٹس میں جمع کرانا شروع کر دیں۔

8) ڈالر یا دیگر بیرونی کرنسیوں کی قیمت میں اُتار چڑھاؤ اور ذخیرے کے طور پر اختیار کردہ کرنسی کی قیمت کا گرنا، جس کی وجہ سے ملکی ذخائر کی قدر میں کمی واقع ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں وہ اشیاء جو پہلے ایک خاص قیمت دے کر درآمد ہو جاتی تھیں، اب اُس کے حصول کے لیے مزید فنڈ درکار ہوتے ہیں۔

اگر شروع میں یہ خسارہ زیادہ نہ ہو تو اِس پر قابو پانا ممکن ہے، بشرط یہ کہ ریاست اِس کے لیے درست اقتصادی پالیسیاں اپنائے۔ لیکن یہ خسارہ ایک بحران کی شکل اختیار کر لے گا اگر ریاست کے پاس موجود ذخائر اِس کے فوری حل کے لیے کافی نہ ہوں کیونکہ ریاست کی ادائیگیوں میں توازن (Balance of payments) کی بہتری کے لیے پالیسیوں اور طریقوں میں تبدیلی، برآمدات کو بڑھانے، درآمدات کو کم کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔

یہاں مالیاتی ذخائر سے مراد وہ ریاستی اثاثے ہیں جو خسارے کو پورا کرنے کے لیے فوری دستیاب ہوں یعنی سونے کے ذخائر، بیرونی کرنسی کے ذخائر یا IMF کے گولڈن سلائس (Golden Slice) میں اُس ملک کا حصہ، یعنی IMF کی پالیسی کہ ہر ممبر ملک کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ آئی ایم ایف میں اپنے شیئر کا ایک چوتھائی حصہ سونے کی صورت میں جمع کراتا ہے یا اپنے خزانے میں موجود ڈالروں اور سونے کا کل دسواں حصہ جمع کرواتا ہے، اِسے گولڈن سلائس (Golden Slice) کہتے ہیں۔

یہاں تک ہم نے اِس بات کو واضح کر دیا کہ سونے کے بدلے تبدیل نہ ہونے والی کرنسیوں اور ادائیگیوں کے عدم توازن (Balance of payments) کے نتیجے میں بحران کیسے جنم لیتے ہیں۔

تاہم اقتصادی بحران کی ایک تیسری وجہ لوگوں میں وسائل کی بُری تقسیم ہے۔ یعنی یہ ممکن ہے کہ کوئی مالی بحران (Cash Crisis) نہ ہو اور نہ ہی ادائیگیوں میں توازن کا بحران ہو، یعنی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے آمدنی کے ذخائر موجود ہوں)، لیکن یہ ذخائر چند لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کی جانے والی درآمدات اور اخراجات پر خرچ ہوں اور باقی لوگوں ان سے محروم رہیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک ملک دس لاکھ دینار کی تیل کی مصنوعات برآمد کرتا ہو اور اتنی گندم درآمد کرے جو عوام کی ضرورت کے لیے کافی ہو تو ہم یہ کہیں گے کہ تجارتی توازن مضبوط ہے اور ادائیگیوں کا توازن بھی مضبوط ہے۔ لیکن اگر اُس ملک کے چند لوگ اپنی مالیاتی حیثیت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ تمام گندم خرید لیں اور باقی لوگ اِسے نہ خرید سکیں تو اِس کی وجہ سے ایک نیا بحران پیدا ہو گا جس کی وجہ لوگوں میں دولت کی عدم تقسیم ہے، جس کے باعث لوگ اپنی بنیادی ضروریات (مثلاً گندم کی ضرورت) کو پورا کرنے سے قاصر رہیں گے اور نتیجتاً غربت ملک میں پھیلنے لگے گی۔

خلاصہ یہ کہ تین جگہوں سے اقتصادی بحران کے جنم لینے کا امکان ہوتا ہے:

1: مالیاتی نظام (Monetary system) سے پیدا ہونے والا بحران۔

2: ادائیگیوں کے توازن (Balance of payments) کے پہلو سے پیدا ہونے والا بحران۔

3: لوگوں میں وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم سے پیدا ہونے والا بحران۔

اقتصادی بحرانوں کا علاج:

اقتصادی بحرانوں کی وجوہات کی حقیقت بیان کرنے کے بعد اب ہم اِن بحرانوں کے درست حل کو بیان کرتے ہیں:

اوّل: موجودہ مالیاتی نظام(Monetary system)سے پیدا ہونے والے بحران کا حل:

ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ایسا مالیاتی نظام (Monetary system) جو سونے کی پشت کے بغیر چلنے والا کاغذی نوٹوں کا ہو یا سونے کے بدلے تبدیل ہونے والے نوٹوں (گولڈ ایکسچینج سسٹم) کا ہو، اِن دونوں نظاموں سے بحران پیدا ہوتا ہے۔ لٰہذا اِس کا حل یہ ہے کہ سونے کی کرنسی والے نظام یا ایسی کرنسی جس کی پشت پر سونا ہو اور وہ بغیر کسی شرط کے تبدیل ہوسکتا ہو، پر واپس لَوٹا جائے۔ یہ بات اب کافی ماہرین سمجھ چکے ہیں۔ اگر امریکہ جیسے ممالک، جو موجودہ کرنسی کے نظام سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں اپنے سیاسی اور اقتصادی برتری کے کھو جانے کی وجہ سے سونے کے نظام کی مخالفت نہ کرتے تو اب تک دنیا واپس سونے کے کرنسی کے نظام پر لوٹ چکی ہوتی۔ کیونکہ اِس نظام سے استحکام حاصل ہوتا ہے اور کسی ایک ملک کو باقی ممالک پر برتری ملے بغیر اقتصادی سرگرمیوں میں تیزی آتی ہے۔ سونے کے نظام میں کرنسی ایک ایسے اثاثے (سونے) کی بنیاد پر ہوتی جس کی اپنی قیمت ہے اور اُس کی قیمت عالمی طور پر پہچانی جاتی ہے۔ اور سونے پہ چلنے والے نظام میں کوئی ملک اپنی من مانی چلاتے ہوئے اپنی کرنسی کی سپلائی میں اضافہ نہیں کرسکتا ہے کیونکہ کرنسی میں اضافے کے لیے اس اضافے کے برابر سونے کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہ موجودہ نظام کے بالکل برعکس ہے جہاں ایک ملک جب چاہے اپنے فائدے کے لیے نوٹ چھاپ دیتا ہے حالانکہ ایسا کرنا افراطِ زر کو براہِ راست جنم دیتا ہے اور کرنسی پر اعتماد کم ہو جاتا ہے۔

تاہم سونے کے نظام میں مندرجہ ذیل شرائط کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہوگا:

1) تمام ممالک کے درمیان سونے کی درآمد اور برآمد پر کسی رکاوٹ یا شرط کے بغیر ہو۔ یہ اِس وجہ سے کہ سونے کی آزادانہ آمد ورفت شرح تبادلہ میں استحکام کی ضامن ہے۔

2) وہ کرنسی، جس کی پشت پر سونا ہو، کو سونے کے بدلے جب چاہے تبدیل کرنے کی آزادی ہو اور نوٹ پر درج قیمت بغیر کسی شرط کے پوری ادا کی جائے۔

3) سونے کو پگھلا کر سونے کے سکے (Bullion) بنانے کی آزادی ہو، پس جس کسی کے پاس سونے کے سکے ہوں وہ انہیں کسی پابندی کے بغیر پگھلا کر اُنہیں سونے کے ٹکڑوں یا ڈھیلوں میں ڈھال سکے۔ اِسی طرح اگر کسی کے پاس سونا کچ دھات کی شکل میں ہو تو وہ سرکاری ٹکسال (Department of minting money) سے اُنہیں سونے کے سکوں میں تبدیل کروا سکتا ہو (سکے ڈھالنے کا خرچ ادا کرنے کے بعد)۔ تاکہ سونے کے سرکاری نرخوں اور تجارتی نرخوں میں fluctuation نہ ہو۔

یہ وہ نتائج ہیں جو اقتصادی ریسرچ کا نتیجہ ہیں۔ جہاں تک اسلامی نقطۂ نظر کا تعلق ہے تو کرنسی کا سونے یا چاندی کے علاوہ کچھ اور ہونا جائز نہیں۔ اس کے شرعی دلائل یہ ہیں:

1) نبی کریم ﷺ نے سونے اور چاندی کو اسلامی ریاست کی کرنسی کے طور پر اپنانے کو قبول کیا اور وزن کے لیے قریش کے درہم اور دینار کے وزن کو مختص کیا، جیسا کہ طاؤس نے ابنِ عمر سے روایت کیا ہے کہ:

((قال رسول الله ﷺ الوزن وزن أهل مكه))

''اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ (سکوں کا) وزن وہ ہے جو مکہ کے لوگوں کا ہے''

اُس زمانے میں 10 درہم کا وزن سات مثقال کے برابر تھا، چنانچہ آج کل کے وزن کے لحاظ سے سونے کے دینار کا وزن 4.25 گرام بنتا ہے۔ اور چاندی کے درہم کا وزن آج کل کے 2.975 گرام کے برابر ہے۔

2) اسلام نے بعض شرعی احکامات کو سونے اور چاندی کے ساتھ مخصوص کیا ہے، مثلاً

الف) اسلام نے سونے اور چاندی کی ذخیرہ اندوزی سے منع کیا ہے، ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلاَ يُنفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾

''اور جولوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے پس انہیں شدید عذاب کی خبر سُنا دو'' (التوبہ:34)

(ب) اسلام نے سونے اور چاندی پر زکوٰۃ عائد کی ہے اور اسے نقدی، نیز خدمات اور محنت پر اُجرت اور خرید وفروخت کے لیے قیمت تصور کیا ہے (یعنی ہر بیس دینار پر آدھا دینار زکوٰۃ، اور ہر 200 درہم پر پانچ درہم زکوٰۃ)

ج) دیت کی قیمت بھی سونے اور چاندی ہی کی بنیاد پر ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دیت کی مقدار 1000 سونے کے دینار یا 12000 چاندی کے درہم کے برابر مقرر کی ہے۔

د) چوری شدہ شے کی کم سے کم قیمت کہ جس سے زیادہ چرانے پر ہاتھ کاٹنے کی حد عائد کی جاتی ہے، وہ بھی سونے کی بنیاد پر ہے، چنانچہ اگر باقی تمام شرائط موجود ہوں تو ہاتھ صرف اُس وقت کاٹا جاتا ہے اگر چوری چوتھائی دینار یا اُس سے زیادہ مالیت کی ہو:

((ان رسول اللّٰہ ﷺ قطع سارقاً فی مجن فیمته ثلاثة دراهم))

''اللہ کے رسول ﷺ نے 3 درہم کی قیمت کی ڈھال چرانے پر اُس کا ہاتھ کاٹا تھا''

ہ) اسلام نے خرید وفروخت کے جو احکامات بیان کیے ہیں تو انہیں بھی سونے اور چاندی کے ذریعے بیان کیا ہے۔

((نهى رسول اللّٰه ﷺ عن الفضة بالفضة والذهب بالذهب اِلا سواء بسواء وأمرنا أن نشترى الفضة بالذهب كيف شئنا ونشترى الذهب بالفضة كيف شئنا))

''اللہ کے رسول ﷺ نے چاندی کے بدلے چاندی اور سونے کے بدلے سونے کے لین دین سے منع فرمایا ہے سوائے اگر وہ برابر مقدار میں ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے اِس بات کی بھی اجازت دی

کہ ہم سونے کے بدلے چاندی اور چاندی کے بدلے سونا جب چاہیں لے سکتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ''ہاتھ کے ہاتھ یعنی بغیر تاخیر کیئے لین دین کی جائے''

ایک اور حدیث میں ہے: ((یداً بید)) یعنی سونے چاندی کا یہ لین دین ''ہاتھ کے ہاتھ یعنی ادائیگی میں کسی تاخیر کے بغیر ہو''

مندرجہ بالا تمام دلائل کی بنیاد پر اسلامی ریاست کی کرنسی سونا اور چاندی ہوتی ہے۔

لہٰذا اگر ہم کرنسی کے بحرانوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ ہم دوبارہ سونے کے نظام پر لوٹیں، خواہ یہ صرف سونے کی بنیاد پر ہو یا پھر سونے اور چاندی دونوں پر ہو۔ تاہم یہ حل رکاوٹوں سے خالی نہیں ہے کیونکہ عالمی سطح پر اجارہ داریاں قائم ہیں، سرحد پار سونے کی نقل و حمل پر ڈیوٹی عائد ہے نیز زیادہ تر سونے کے ذخائر سپر پاورز یا اُن ریاستوں کے خزانوں میں موجود ہیں جو بہت زیادہ پیداواری صلاحیت کے حامل ہیں اور عالمی تجارتی میدان پر چھائے ہوئے ہیں اور اپنے سائنس دانوں، تکنیکی ماہرین اور انجینئرز کی وجہ سے باقی ممالک سے کافی آگے ہیں۔ سونے اور چاندی کے نظام کی طرف لوٹنے میں یہ وہ تمام مسائل ہیں جو کھوکھلے کاغذی نوٹوں پر نظام کو استوار کر لینے کے علاوہ ہیں۔

اِن مسائل پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ جو ریاست سونے کے نظام پر لوٹنے کی خواہاں ہو وہ خود کفالت کی پالیسی اپنائے اور اپنی درآمدات کو حتیٰ الامکان کم کرے اور جو درآمدات کرے وہ اُن اشیاء کے بدلے کرے جن کی وہ حقیقتاً مالک ہو۔ نیز وہ اپنی اشیاء کو اُن چیزوں کے عوض برآمد کرے یا بیچے جو اُس کی ضرورت ہیں، یا وہ انہیں سونے چاندی کے عوض فروخت کرے یا ایسی کرنسی کے عوض کہ جس سے وہ اپنی ضرورت کی اشیاء درآمد کر سکے۔

یہ طریقہ ہر ریاست کے لیے ہے۔ جہاں تک خلافت کا تعلق ہے جو انشاء اللہ بہت قریب ہے، تو اُس کے لیے کافی آسان ہے۔ اسلامی ممالک کے بینکوں اور خزانوں میں جو سونا موجود ہے وہ خلافت کے سونے کی بنیاد (Gold Standard) پر لَوٹنے کے لیے کافی ہے۔

یہ اُس چاندی کے علاوہ ہے جو اسلامی ممالک میں بکثرت موجود ہے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ خلافت میں سونے کے ساتھ ساتھ چاندی بھی کرنسی کی ایک بنیاد ہوگی، کیونکہ ریاستِ خلافت میں کرنسی کی بنیاد سونا اور چاندی پر مشتمل دودھاتی بنیاد (bi-metallic standard) پر ہوتی ہے۔ اِس طریقے سے خلافت اِس قابل ہوگی کہ وہ سونے اور چاندی کی بنیاد پر واپس لوٹ جائے۔

اِس کے علاوہ اسلامی ممالک کے پاس وہ تمام خام مال (raw material) موجود ہے جو ایک قوم کی ضرورت ہوتا ہے۔ چنانچہ اِن کے ذریعے اسلامی ریاست بنیادی ضروریات کے معاملے میں دوسروں کی یا تو بہت کم محتاج ہوگی یا بالکل ہی نہ ہوگی۔ لہٰذا خلافت اندرونی وسائل پر انحصار کر کے درآمدات کو کم کر دے گی اور اِس کی وجہ سے خلافت میں موجود سونا بیرونِ ملک جانے کے بجائے اندر ہی رہے گا۔

مزید برآں، اسلامی علاقوں میں تیل جیسے اہم وسائل موجود ہیں جس کی ضرورت پوری دنیا کی اقوام کو ہے۔ چنانچہ ریاستِ خلافت تیل کو سونے کے عوض یا ضرورت کی اشیاء کے بدلے یا پھر اُس کرنسی کے عوض فروخت کر سکتی ہے، جو ضرورت کی اشیاء کو خریدنے اور خدمات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اور خلافت تیل جیسے اہم وسائل پر یہ پابندی بھی لگا سکتی ہے کہ یہ صرف سونے کے عوض ہی فروخت کیے جائیں گے، تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ریاستِ خلافت کے سونے کے ذخائر میں اضافہ ہو۔

سونے کے نظام (Gold Standard) پر لوٹنے سے استحکام آئے گا اور بحرانوں کا خاتمہ ہوگا اور چند ممالک کی دوسرے ممالک پر اجارہ داری بھی ختم ہو جائے گی۔ یہ ہے کرنسی کے بحرانوں کا موزوں اور مؤثر حل۔

دوم: اُس بحران کا حل جو ادائیگیوں کے توازن (Balance of

(payments) کے پہلو سے پیدا ہوتا ہے:

ہم اوپر یہ بیان کر چکے ہیں کہ جب ادائیگیوں کے توازن (Balance of payments) میں خسارہ آتا ہے یعنی آمدن اِس قابل نہیں ہوتی کہ وہ ادائیگیوں کو پورا کر سکے تو بحران جنم لیتا ہے۔ اِس خسارے پر قابو پانے کے لیے ریاستیں کچھ عارضی حل اپناتی ہیں اور چند پالیسیاں اور اقدامات متعارف کراتی ہیں تاکہ وہ اپنی معیشت میں دوبارا جان ڈال سکیں اور ادائیگیوں کے توازن (Balance of payments) میں بہتری لاسکیں۔

اس سلسلے میں ممالک جو اقدامات اٹھاتے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

1) مارکیٹ کی شرح سود کو بڑھانا تاکہ بیرونی سرمائے کی ملک کے اندر آنے کی حوصلہ افزائی ہو۔

2) درآمدات کو کم کرنے کے لیے درآمدی اشیاء پر کسٹم ڈیوٹیوں اور دیگر ٹیکس یا حربوں کا نفاذ۔

3) اپنی کرنسی کی قیمت کو گرانا تاکہ ملکی اشیاء کی قیمتیں بیرونی مارکیٹوں میں گریں اور اِس وجہ سے غیر ملکی اِن اشیاء کو خریدنے میں اضافہ کریں (کیونکہ اِس طریقے سے اس ملک کی برآمدی اشیاء غیر ملکیوں کے لیے سستی ہو جاتی ہیں)۔ باالفاظِ دیگر اِس طریقے سے برآمدات میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ حربہ صرف اُس وقت کامیاب ہے جب جن اشیاء کو برآمد کرنا ہے وہ کثیر تعداد میں تیار کی جا چکی ہوں تاکہ اِن کو فوری برآمد کر کے آمدنی حاصل ہو سکے۔

تاہم اگر ریاست نے برآمد کے لیے کثرت سے مال تیار نہ کیا ہو تو یہ اقدام الٹا نقصان دہ بن جاتا ہے کیونکہ کرنسی کی قیمت گرنے سے اندرونِ ملک اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ملکی کرنسی کی قیمتیں گرانے سے ریاست کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ برآمدات بڑھ جاتی ہیں اور ریونیو (revenue) میں اضافہ ہوتا ہے بشرطیکہ ریاست کے پاس کثیر تعداد میں مال برآمد کرنے کی صلاحیت موجود ہو اور دوسرے ممالک جو یہی اشیاء بیچ رہے ہیں اپنی کرنسی کی قیمت نہ گرائیں۔

4) ملک میں موجود قدرتی وسائل کی تلاش پر سنجیدہ کام تا کہ اِنہیں برآمد کر کے ملک کی اقتصادی صورتحال بہتر بنانے کے لیے آمدنی حاصل ہو سکے۔ لیکن اِس کام کے ساتھ ساتھ ریاست کی توجہ بنیادی ضرورت کی چیزیں پیدا کرنے سے نہیں ہٹنی چاہیے ورنہ انہیں بعد میں درآمد کرنا پڑتا ہے جس سے آمدنی میں کمی واقع ہوتی ہے۔

5) یہاں پر اِس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ کچھ ممالک یا پھر تقریباً سارے بڑے ممالک اپنے خساروں کو پورا کرنے کے لیے اپنی کرنسیاں چھاپنا شروع کر دیتے ہیں اور اِن کرنسیوں کی پشت پر کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اِس لیے کرتے ہیں تا کہ اُنہیں قرضے نہ لینے پڑیں اور نہ ہی ایسے سخت اقدامات اُٹھانے پڑیں جن کی وجہ سے عوام میں بے چینی پھیلے اور نہ ہی اپنی کرنسی کی قدر گرانی پڑے، کہ جس سے ان کے وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ لیکن بہر حال اس طرح نوٹ چھاپنے سے افراطِ زر میں اضافہ ہوگا یعنی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ جو کہ اشیاء اور کرنسی کی مقدار میں عدم توازن سے پیدا ہوتا ہے۔ عام طور پر افراطِ زر پر قابو پانے کے لیے کرنسی کے حجم اور اشیاء اور خدمات (services) میں توازن پیدا کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ اِس طرح ہوتا ہے کہ یا تو پیدا وار بڑھا کر اشیاء او خدمات (services) بڑھائی جائیں یعنی اقتصادی صورتحال بہتر بنا کر خصوصاً پیداوار میں بہتری لا کر، اور یا پھر مارکیٹ میں زائد کرنسی کو خرید کر اُسکی مقدار کو مارکیٹ میں کم کیا جائے۔ کرنسی کو مارکیٹ میں کم کرنے کا طریقہ کرنسی پر شرح سود بڑھانا ہے جس کے باعث لوگ میں رجحان پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی کرنسی کو بینکوں میں رکھوائیں۔ یا پھر یہ اِس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ تمام تجارتی بینکوں سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ مرکزی بینک میں موجود اپنے کرنسی کے حصے کو بڑھا دیں اور اس کے بعد اس کرنسی کو منجمد کر دیا جائے اور یوں کرنسی کو گردش سے باہر نکال لیا جائے۔ تاہم اِن اقدامات سے بُرے نتائج بھی پیدا ہوتے ہیں کیونکہ اِن اقدامات کے نتیجے میں سرمایہ کاری کم ہو جاتی ہے اور اقتصادی صورتحال جمود پیدا ہوتا ہے۔

6) خسارے کو پورا کرنے کا ایک اور طریقہ قرضے لینا ہے جس سے ادائیگیوں میں توازن قائم ہوتا ہے۔ لیکن جب قرضے لیے جاتے ہیں تو ایک نیا بحران پیدا ہو جاتا ہے جہاں یہ ملک قرضوں کی

دلدل میں پھنس سکتا ہے خاص طور پر جب یہ قرضہ ایسے منصوبوں کے لیے استعمال نہ ہو جو ملکی آمدنی میں اضافہ کا باعث بنیں۔ اور یہی تیسری دنیا کے زیادہ تر ممالک کے ساتھ ہوا ہے۔ اِن ممالک نے قرضوں کے حصول کو خسارے کو پورا کرنے کا سب سے آسان طریقہ سمجھا کیونکہ اِن ممالک میں کچھ تو اپنی بنیادی ضرورت کی چیزیں تک نہیں پیدا کرتے۔ اور دوسری طرف اِن کے پاس برآمد کرنے کے لحاظ سے چند اشیاء کے سوا کوئی خاص اشیاء نہیں ہوتی۔ پس وہ قرضوں کے ذریعے خسارے کو پورا کرنے کو ہی ممکن حل سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ درآمدات میں کمی کرتے ہیں تو ملک میں اشیاء کی قلت پیدا ہوتی ہے جس سے اُن کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور نتیجتاً پیداواری عمل میں خلل واقع ہوتا ہے جس سے بیروزگاری بڑھتی ہے اور ترقی اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اگر ریاست چاہے کہ یہ خسارہ اپنے موجودہ سونے اور خارجہ کرنسی کے ذخائر (Reserves) سے پورا کرے تو یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ عموماً تیسری دنیا کے ممالک کے پاس یہ ذخائر بہت کم ہوتے ہیں۔ مزید برآں اگر یہ ذخائر خسارہ پورا کرنے میں لگ گئے تو اِس سے ذخائر خطرناک سطح تک کم ہوجائیں گے، جس کے نتیجے میں ملکی کرنسی کی قیمت گرنے لگے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں کئی ممالک اپنے ہاں پائے جانے والے قدرتی وسائل کے موثر استعمال پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دیتے۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ملک مسلسل قرضوں کے لیے ہاتھ پھیلائے رکھتا ہے۔ جو چیز قرضوں کے بحران کو شدید کرتی ہے وہ اِن قرضوں کا تین مہلک امور کے ساتھ منسلک ہونا ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

الف) اِن قرضوں کو ایسے منصوبوں میں استعمال کرنا جن کا پیداواری لحاظ سے کوئی فائدہ نہ ہو، جیسا کہ اِن قرضوں کو تفریحی منصوبوں پر صَرف کر دینا یا پھر بے وقعت اشیاء پر لُٹا دینا۔ یہ سب اقتصادی لحاظ سے مفید نہیں بلکہ الٹا خسارے میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

ب) اعلیٰ سرکاری عہدیداروں کا کمیشن (Commission) اور رشوت کے ذریعے قرضوں کا ایک بڑا حصہ غبن کر لینا۔ یہ سرکاری عہدیدار فوج کی طرف سے تختہ الٹنے کے ڈر یا حکومت کی تبدیلی کے خطرے کو مدنظر رکھتے ہوئے اِس غبن کئے ہوئے مال کو محفوظ کرنے کی

خاطر بیرونی ممالک سمگل کر دیتے ہیں اور اِس طرح وہ ملک کو دوہرا نقصان پہنچاتے ہیں یعنی ایک تو عوام کے پیسے میں سے ایک بڑے حصہ غبن ہو جاتا ہے، جسے ترقیاتی کوششوں اور معیشت کی بحالی پر صَرف کیا جانا چاہیے تھا تاکہ ملکی اقتصادی صورتحال میں بہتری آتی اور دوسرے یہ کہ غبن کردہ دولت ملک سے باہر سمگل کر دینے سے سرمایہ ملک پر خرچ ہونے کی بجائے ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔ اِسی مسئلے پر امریکہ میں موجود مورگین ٹرسٹی بینک (Morgan Trustee Bank) نے حال ہی میں ایک سٹڈی رپورٹ جاری کی ہے جس میں اندازا لگایا گیا ہے کہ تیسری دنیا کو دیئے جانے والے قرضوں کا 40 سے 60 فیصد حصہ اعلیٰ عہدیداروں کے نام سے یا اُن کے رشتے داروں کے نام سے کھلے ہوئے خصوصی اکاؤنٹس کے ذریعے واپس پہلی دنیا کے بینکوں میں آجاتا ہے۔ چنانچہ رپورٹ کے مطابق 80 کی دہائی سے تیسری دنیا کو جاری کیئے گئے تقریباً 1500 ارب ڈالر کے قرضوں میں سے تقریباً 1000 ارب ڈالر پہلی دنیا کے بینک اکاؤنٹس میں واپس آچکے ہیں جو کہ تیسری دنیا کے موجودہ یا سابقہ اعلیٰ عہدیداروں کے نام سے کھلے خصوصی اکاؤنٹس میں جمع ہیں۔

ج) سپر پاورز یا پھر بااثر بڑے ممالک اِن قرضوں کو تیسری دنیا پر اپنے اقتصادی اور سیاسی اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایسی پالیسیاں مرتب کرتے ہیں جس سے تیسری دنیا کے ممالک کو قرض لینے کی ترغیب ملے اور پھر تیسری دنیا کے یہ ممالک قرضے دینے والے ممالک کے مقاصد کو پورا کرنے پر آمادہ ہوں خواہ وہ مقاصد اقتصادی ہوں یا سیاسی۔ اِس بات کے چند ثبوت یہ ہیں:

مارچ 1963ء کے آخری ہفتے میں امریکی امداد کے بارے میں جنرل کلے کمیٹی (Commitee of General Clay) نے رپورٹ شائع کی جس میں کہا گیا تھا کہ امریکہ کے تیسری دنیا کے ممالک کو قرض دینے کی وجہ اور وہ شرائط جن پر یہ قرضے دیئے جاتے ہیں، حقیقت میں امریکہ اور لبرل ممالک کا تحفظ کرنا ہے۔ یعنی اِن قرضوں کا مقصد تیسری دنیا کی امداد کرنا نہیں بلکہ اُنہیں اپنے زیرِ اثر لانا ہے۔ پس 60ء کی دہائی کی شروعات میں انڈونیشیا میں

امریکہ نے انتشار پیدا کر کے اُس پر دباؤ ڈالا کہ وہ قرض لے۔ آج بھی گرانٹس اور قرضے سپر پاورز چھوٹے ممالک پر سیاسی غلبے کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی ادائیگیوں کا توازن ہمیشہ خسارے میں رہتا ہے لیکن وہ پھر بھی ہر سال قرض اور گرانٹس جاری کرتا رہتا ہے۔

1974ء اور 1979ء میں اوپیک (OPEC) ممالک کی ادائیگیوں کے توازن میں اخراجات کے مقابلے میں آمدنی بے تحاشہ تھی لہٰذا آمدنی کی یہ زیادتی عالمی مالیاتی مارکیٹوں میں آ گئی جس سے عالمی کمرشل بینکوں نے اپنی حکومتوں کی حوصلہ افزائی ملنے پر ’’recycling of oil surpluses‘‘ کی پالیسی شروع کی۔ اِس پالیسی کے تحت وہ ترقی پذیر ممالک جن کی ادائیگیوں کے توازن میں خسارہ تھا، کو خسارہ پورا کرنے کے لیے اِن زائد ذخائر سے قرضے نسبتاً نہایت کم سودی شرح اور آسان شرائط پر جاری کئے جانے تھے۔ اِن آسان شرائط نے بہت سے ترقی پذیر ممالک کو اپنے خسارے پورے کرنے کے لیے متوجہ کر لیا۔ بہر حال خسارے میں ڈوبے ترقی پذیر ممالک کو قرضے دینے میں بینکوں کے لیے ہمیشہ ایک خطرے (risk) کا امکان ہوتا ہے، لہٰذا اِس خطرے سے بچنے کے لیے انہوں نے ’’floating‘‘ یا تبدیلی کے لائق شرحِ سود کی پالیسی نکالی جس کے تحت ہر تھوڑے عرصے بعد شرحِ سود لندن اور نیویارک کی مارکیٹوں کے شرحِ سود کے برابر لیا جائے گا۔ مزید تحفظ کے لیے بینکوں نے ایک فیصد اضافی شرحِ سود بھی شامل کیا جو کہ خطرے کے منافع (risk premium) کی خاطر تھا۔ یہ تبدیلی کے لائق شرح سود میں موجود ممکنہ خطرے کا اندازا اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 78-1974 کے درمیان ڈالر پر شرحِ سود 7.8 فیصد تھا جب کہ 81-1979 کے دور تک اِس کی شرح 17.5 فیصد تک پہنچ چکی تھی۔ یعنی حقیقت میں بینکوں نے پہلے تو ترقی پذیر ممالک کو قرض لینے کے لیے آسانیاں پیدا کیں، اور جب وہ قرضوں کے جال میں آ گئے تب اُن پر تبدیلی کے لائق قرضوں کے ذریعے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

اِن تمام وجوہات کی وجہ سے یہ بات واضح ہے کہ اگر ایک مرتبہ کوئی ملک اِن قرضوں کی

راہ اپنا لیتا ہے تو پھر وہ اُس کے جال میں پھنس جاتا ہے جس سے نکلنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ اور جو بات مسئلہ کو زیادہ گھمبیر بناتی ہے وہ یہ کہ استعماری ریاستوں نے چھوٹے ممالک کو قرضوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے جو راستہ بنایا ہے وہ عالمی مالیاتی فنڈ (IMF) اور ورلڈ بینک کے ذریعے ہے۔ اِن دوا داروں سے جب یہ ممالک قرضے لیتے ہیں تو یہ اُن کو مسئلوں کی چکی میں پھنسا دیتے ہیں۔

قرضوں کا بحران میں شدت سے جب بھی کوئی ریاست اپنا قرض (بشمول سود اور دیگر منافع جات) واپس کرنے میں ناکام ہوتی ہے تو اُس کی پہلی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اِن قرضوں کی تاریخ کو آگے بڑھوانے میں کامیاب ہو جائیں اور ساتھ ہی ساتھ مزید قرض لے لیتی ہے تاکہ اُن کا اقتصادی پہیہ چلتا رہے۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے قرض دینے والے ممالک کا گروپ یعنی پیرس کلب اور قرض دینے والا کمرشل بینکوں کا گروپ یعنی لندن کلب دونوں کے دونوں کلب مقروض ممالک سے کہتے ہیں کہ وہ پہلے IMF سے اعتماد اور بھروسے کا سٹرفکیٹ حاصل کریں، جیسا کہ اچھی چال چلن کا سٹرفکیٹ ہوتا ہے۔ اِس سٹرفکیٹ کا مطلب ہوتا ہے کہ مقروض ملک درست اقتصادی طرزِ عمل اپنائے گا۔ لیکن اِس سٹرفکیٹ کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مقروض ملک ایک اقتصادی اصلاحات کے پروگرام پر عمل درآمد شروع کرے۔ اِن اصلاحات میں عموماً ملکی کرنسی کی قیمت گرانے کے ساتھ ساتھ تمام بنیادی ضروریات کی اشیاء پر سے سبسڈی کا خاتمہ کرنا، لوگوں کی تنخواہوں میں اضافہ روکنا یا اُن کی سرے سے ادائیگی میں تاخیر کرنا، سرکاری ملازمین کی تعداد میں کمی کرنا، عوامی سہولیات بالخصوص توانائی کے شعبہ کی قیمتوں میں اضافہ کرنا، ملکی کرنسی پر شرحِ سود بڑھانا تاکہ بچت بڑھے اور بیرونی سرمایہ ملک میں آئے اور اِسی کے ساتھ آزاد تجارتی پالیسی اپنانا یعنی غیر ملکی تجارت پر عائد پابندیوں کو دور کرنا شامل ہوتا ہے۔

IMF کے ذریعے قرضوں کے مسئلے کو حل کرنا حقیقت میں مسئلے کو زیادہ گھمبیر بنا دیتا ہے، کیونکہ IMF کے پروگرام میں مذکور مسئلے کے حل کی بنیاد محض حسابی (arithmetic basis) ہوتی ہے۔ IMF اِس مسئلے کو صرف ایک ریاضیاتی مساوات سمجھتا ہے کہ جس کی دونوں

اطراف کو برابر بنانے کی ضرورت ہو، پس وہ اخراجات اور آمدن میں توازن قائم کرنے کے لیے یا تو آمدن میں اضافے کا سوچتا ہے اور یا تو اخراجات میں کمی لانے کا اور اِس بات کی قطعاً فکر نہیں کرتا کہ اِس مجوزہ حل کا انسانوں کی زندگیوں اور اُن کے معاملات پر کیا اثر پڑے گا۔ مثال کے طور پر IMF آمدن کو بڑھانے کے لیے ٹیکس کی شرح میں اضافہ کرنے کو کہے گا حالانکہ وہ بخوبی واقف ہے کہ مقروض ممالک میں شرحِ ٹیکس ویسے ہی لوگوں کی استطاعت سے زیادہ نہیں تو کم از کم استطاعت کی حد تک ہوتی ہے۔ یا IMF یہ جانتے ہوئے بھی کہ اِن ممالک میں روٹی، دودھ، چاول، چینی، گندم اور ایندھن جیسی بنیادی ضرورت کی اشیاء کی قیمتیں ویسے ہی لوگوں کی پہنچ سے باہر ہوتی جارہی ہیں، وہ اِن اشیاء پر دی جانے والی سبسڈی کے خاتمے کی ہدایات دیتا ہے۔ یا وہ یہ جاننے کے باوجود کہ مقروض ممالک کی پیداواری اور برآمدی قابلیت بہت کمزور ہے، وہ ملکی کرنسی کی قدر گرانے کو کہتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ اشیاء کی قیمتوں اور بیروزگاری میں اضافے کی صورت میں نکلتا ہے۔ IMF کی ہدایات کے وجہ سے جہاں ایک طرف بنیادی اشیاء کی چیزیں مہنگی ہوتی ہیں وہیں دوسری طرف IMF یہ ہدایات بھی جاری کرتا ہے کہ ملازمین کی تنخواہوں کے بڑھانے پر پابندی عائد کی جائے۔ بلکہ بسا اوقات IMF اِس حد تک تجاویز دیتا ہے کہ اُن کی تنخواہیں کم کردی جائیں تاکہ سرکاری اخراجات کم ہوجائیں۔ مثال کے طور پر IMF نے برازیلین حکومت سے مطالبہ کیا کہ اگر وہ مزید قرض لینا چاہتا ہے تو سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کو 20 فیصد تک کم کردے۔ دسمبر 1985 میں IMF نے نائیجیریا سے اپنی کرنسی کو 60 فیصد تک گرانے کو کہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ تیل کی مصنوعات سے تمام سبسڈی ختم کرنے کا بھی مطالبہ کیا تھا۔ 1986 کی شروعات میں IMF نے سوڈان سے بھی کرنسی کی قیمت گرانے اور سبسڈی ختم کرنے کے ساتھ ساتھ قیمتوں کو آزاد چھوڑنے (Liberalising of prices) کا مطالبہ کیا تھا۔ اِسی طرح مصر سے 70 کی دہائی میں، مراکش اور تیونس سے 1984 کی شروعات میں، ڈومیکین ریپبلکن سے اپریل 1984 اور فروری 1985 میں، اردن سے اپریل 1989 میں سبسڈی کم کرنے اور قیمتوں میں اضافے کے مطالبات کئے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے اِن ممالک کی عوام نے

IMF کی وجہ سے پڑنے والے بوجھ کے خلاف بطورِ احتجاج ہنگامہ آرائی شروع کر دی تھی۔

تاہم IMF کے ان تمام ظالمانہ مطالبات کا مطلب قرضوں سے نجات نہیں بلکہ ان مطالبات کو پورا کرنے کے بدلے میں IMF صرف قرضوں کی واپسی کی تاریخ کو آگے کر دیتی ہے(rescheduling)۔ باالفاظِ دیگر کہ یہ تمام جابرانہ مطالبات صرف واپسی کی تاریخ کو بڑھانے کے لیے ہیں جہاں نئی تاریخِ واپسی تک قرضوں اور سود کا بوجھ اور زیادہ ہو چکا ہو گا۔

اور عام طور پر ورلڈ بینک کا قرض دینے کے حوالے سے کردار IMF کی طرح ہی ہے۔ IMF اُن ممالک کو قرض نہیں دے سکتا جو اُس کے قوانین کے مطابق قرضوں حاصل کرنے کی زیادہ سے زیادہ حد کو پہنچ چکے ہیں۔ عموماً قرضوں پر مبنی منصوبے اِس طرح سے ترتیب دیئے گئے ہوتے ہیں جو اِن مقروض ممالک کی ترقی میں رکاوٹ بن جائیں اور اِن ممالک کی معیشت زیادہ تر بیرونی امداد کی محتاج بن جائے۔

حقیقت میں IMF اور ورلڈ بینک کی پالیسیاں وہ حاصل نہیں کر سکیں جن کا وہ دعویٰ کرتے ہیں۔ بلکہ اِن مقروض ممالک میں کہیں معیشت کی بحالی نظر نہیں آتی، اُلٹا قرضوں میں ڈوبے ہوئے ممالک کے قرض ختم ہونے کی بجائے مزید بڑھ چکے ہیں، اور یہ قرضے اِس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ مقروض ملک IMF کی ہدایات پر چل کر اِن کو ختم کرنے کے قابل ہی نہیں رہے۔

IMF اور ورلڈ بینک کے ذریعے نافذ موجودہ عالمی اقتصادی نظام، جو انسانی فطرت اور عقل کے خلاف ہے، کی طرف تجویز کردہ حل کے نتیجے میں اِن ممالک میں ہونے والی اقتصادی بدحالی کا اندازہ لگانے کے لیے میں یہاں پر کچھ ممالک کے قرضوں کا حجم بیان کروں گا جو اِن اصلاحات کے نتیجے میں جمع ہوا ہے:

اوّل: ترقی پذیر ممالک کے قرضے:

1972 میں اِن ممالک کے کل قرضے 91 ارب ڈالر تھے جبکہ 1986 کے آخر تک یہ

قرضے 1000 ارب ڈالر سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اِن قرضوں میں اسلامی ممالک کا حصہ 22.4 فیصد تھا، جبکہ عرب ممالک کا حصہ 15 فیصد کے قریب تھا جو لگ بھگ 200 ارب ڈالر کے برابر ہے۔

دوم: ترقی پذیر ممالک کی طرف سے قرضوں پر اب تک کی گئی ادائیگیاں (debt servicing):

اِن ممالک کی ادائیگیاں (یعنی سالانہ اقساط اور قرضوں پر سود) کا حجم 1972 میں 7.3 ارب ڈالر تھا جو 1986 میں بڑھ کر 95.8 ارب ڈالر ہو گیا تھا۔ اِس میں اسلامی ممالک کا حصہ 1972 میں 1.56 ارب ڈالر تھا جو کہ 1986 کے آخر تک بڑھ کر 23.5 ارب ڈالر ہو گیا تھا۔

سوم: مقروض عرب ممالک میں مصر سرِفہرست ہے:

1986 تک مصر کا قرضوں کا حجم 40 ارب ڈالر تھا۔ یہ رقم اُس قرضے کی ہے جو 1970-85 کے عرصے کے دوران لیے گئے۔ اقساط (Premiums)، سود کی رقم اور بقایا جات جو جنوری 1987 سے جون 1988 کے درمیان مصر کو واپس کرنا تھا وہ 10 ارب ڈالر سے بھی تجاوز کر گیا تھا۔

چہارم: اردن:

70 کی دہائی کے دوسرے نصف سے لے کر 80 کی دہائی کے شروع تک اردن کے قرضوں کا حجم ٹھیک ٹھاک بڑھ گیا، 1972 سے 1988 کے درمیان یہ قرضے سو گنا سے زیادہ بڑھ چکے تھے۔ نتیجتاً 1988 کے آخر تک کُل قرضے تقریباً 12 ارب ڈالر ہو چکے تھے۔ اب تک کی تمام ادائیگیاں کرنے کے بعد بھی قرضوں کا حجم 5.6 ارب ڈالر کے قریب ہے۔ 1989 کے آخر میں بقایا جات (Balance) تقریباً 8 ارب ڈالر تھا جبکہ اُس پر سود 3 ارب ڈالر تک پہنچ چکا تھا۔

نتیجتاً 15 اکتوبر 1988 میں حکومت دینار کی شرح تبادلہ float کرنے پر مجبور ہوگئی اور اُس کے بیرونی کرنسیوں کے ذخائر مسلسل کمی کے باعث نچلی ترین سطح پر پہنچ گئے جس کی وجہ سے حکومت نے تجارتی (commercial) بینکوں کو غیر ملکی کرنسی دینے پر پابندی لگادی۔ 1988 میں اِن ذخائر کا حجم ملکی کرنسی کے صرف 14 فیصد کو سہارا دینے کے قابل تھا، اور دو ہفتوں سے زیادہ کی درآمدات کو سہارا دینے کے قابل نہ تھا۔ اِس صورتحال نے حکومت کو 1988 کے آخر میں تمام بیرونی قرضوں کی ادائیگیوں کو روکنے پر مجبور کردیا۔

پانچویں مثال:

1980 میں ترقی پذیر ممالک کے قرضوں اور کُل ملکی پیداوار (GDP) کا تناسب 28 فیصد تھا جو بڑھتے بڑھتے 1986 میں 48 فیصد تک پہنچ گیا۔ اور اسلامی ممالک کا قرضوں اور GDP میں تناسب 1986 میں 58 فیصد پہنچ گیا تھا۔ مصر میں یہ تناسب خاص طور پر زیادہ تھا جہاں یہ تناسب 1982 میں 89 فیصد تھا اور 1986 میں یہ 74 فیصد تھا جبکہ اردن میں کمزور ملکی پیداوار کی وجہ سے یہ تناسب 1988 میں 300 فیصد تھا جو تمام مقروض ممالک کے مقابلے میں سب سے زیادہ تھا۔

یہ صرف چند اعداد و شمار کی مثالیں ہیں جو اِس بات کی قطعی دلیل ہیں کہ قرضوں کے حجم میں 1982 کے بعد سے بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور یہ وہی سال ہے جس کے بعد سے اب تک میکسیکو اپنے قرضوں کی ادائیگیاں (services) کرنے کے قابل نہیں رہا۔ اِن تمام کی وجوہات موجودہ عالمی اقتصادی نظام کے تجویز کردہ غلط تدارک (Treatment) اور IMF اور ورلڈ بینک کی غلط پالیسیاں ہیں۔

آج مسلم ممالک میں موجودہ قرضوں کی وجہ سے آنے والے بحران سے مندرجہ ذیل طریقوں سے ہی نپٹا جاسکتا ہے:

1) تمام قرضوں پہ لاگو سود کی ادائیگی کو بند کرنا، کیونکہ یہ رِبا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴾

''اور اگر تم توبہ کرلو (اور سود چھوڑ دو) تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو، نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے'' (البقرہ:279)

2) قرضوں کو بغیر سود کے ادا کرنا:

قرضوں کے مسئلے کو حل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اُن تمام لوگوں کو اِس کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے جنہوں نے قرضے لینے کے ادوار میں حکومت میں شمولیت اختیار کی ہو یا پھر کوئی حکومتی عہدہ سنبھالا ہو۔ یہ اِس لیے کہ وہ اِنہی ادوار میں مال دار ہوئے ہیں۔ لہٰذا قرضے اِنہی لوگوں کی عام ضروریات سے زیادہ موجود مال سے اور اُسی تناسب سے جس تناسب میں اُن کے مال میں اضافہ ہوا ہے، واپس کیے جانا چاہییے۔ یعنی اگر پہلے شخص کا زائد مال 10 لاکھ، دوسرے کا 5 لاکھ اور تیسرے کا ڈھائی لاکھ ہو تو پھر قرضوں کی واپسی کی ذمہ داری میں بھی اُن کا تناسب اِسی حساب سے 4:2:1 ہونا چاہییے۔

جہاں تک اِس بات کا تعلق ہے کہ حکمرانوں پر ہی یہ ذمہ داری کیوں ڈالی جائے، تو اِس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

الف) اسلام میں حکمران کی ذمہ داری عوام کے تمام امور کی دیکھ بھال کرنا ہے، اور اِن امور میں اقتصادی امور بھی شامل ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے:

((الامام راع و هو مسئوول عن رعيته))

''امام ذمے دار ہے، اور وہ اپنی ذمہ داری کے حوالے سے جوابدہ ہے''

ب) وہ شخص جو کوئی حکومتی عہدہ رکھتا ہے تو اُس کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی تجارتی کام میں شامل ہو۔ وہ صرف اپنے ماہانہ معاوضے کا حق دار ہے۔ تو اگر وہ اپنے دور میں مال دار

ہو جاتا ہے، تو اُس کا احتساب ہونا چاہیے، اور یہ بات آج کل کے تمام حکمرانوں میں مشترک ہے کہ اُنہوں نے حکومتی قرضوں سے مال کھا کر اپنی دولت بڑھائی ہے۔ جب عمرؓ کو اپنے کسی والی (گورنر) پر بدعنوانی کا شبہ ہوتا تو یا تو وہ حساب شدہ مال سے زائد مال کو ضبط کر لیتے یا پھر وہ اسے بانٹ دیتے۔ وہ عہدہ دیئے جانے سے قبل اور واپس لیے جانے کے بعد والیوں کی دولت کا حساب لگاتے اور اگر اُن کے اصولی حساب سے زیادہ پایا جاتا تو وہ یا تو اُس کو ضبط کر لیتے اور یا وہ اُس کو تقسیم کر دیتے اور ضبط کیے ہوئے مال کو ریاستی خزانے (بیت المال) میں جمع کر دیتے۔ یہ اُن کی ذاتی ملکیت پر دست درازی نہیں کیونکہ یہ آمدنی ناجائز تھی۔ کیونکہ اگر کوئی شخص کسی حکومتی عہدے پر فائز ہو اور وہ اپنے دورِ حکومت کے دوران بہت مال دار ہو جائے تو یہ اُس مال کو ضبط کرنے کے لیے ثبوت کے طور پر کافی ہے، کیونکہ اُس کا جائز حق صرف اُس کی تنخواہ ہے اور یہ تمام مال اُس سے زائد ہے۔ لیکن جہاں تک اُن سرکاری ملازمین کا تعلق ہے جو کسی حکومتی عہدے پر فائز نہیں تو اُن کا مال اُس وقت تک ضبط نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ قانونی طور پر کوئی واضح ثبوت نہ ملے کہ اس نے یہ مال چرایا ہے یا ناجائز ذریعے سے حاصل کیا ہے۔ جو کچھ بھی والیوں یا سرکاری ملازمین سے ضبط کیا جائے گا وہ سرکاری خزانے کا حصہ بنے گا، اور قرضے اُس سے ادا کیے جائیں گے۔

ج) قرضے لینا اور عوام کو مقروض کر دینا امت کے لیے نقصان کا سبب ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لا ضرر ولا ضرار))
''نقصان (نہ اپنے آپ کو پہنچانا جائز ہے) اور نہ دوسروں کو''

پس نقصان کو دور کرنا ضروری ہے اور یہ ذمہ داری اُن پر ہے جو اِس نقصان کا سبب بنے ہیں۔

3) نئے قرضے نہیں لیے جائیں گے کیونکہ مالیاتی ضروریات کے لیے بیرونی قرضوں کا حصول ملک کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ پچھلے ادوار میں یہی قرضے کسی ملک کو نوآبادیاتی

(colonise) بنانے کا ذریعہ تھے جب کہ آج کل یہی قرضے دیگر ملکوں پر اپنا اثر ورسوخ بڑھانے اور منصوبہ بندیاں کرنے کا سب سے اہم طریقہ بن چکے ہیں۔ عام طور پر یہ قرضے اُس وقت تک جاری نہیں کیئے جاتے جب تک کہ اس ملک کے اقتصادی پوشیدہ معاملات کو تفصیل سے سمجھ نہ لیا جائے اور پھر اُن کے لیے منصوبے ترتیب دیئے جاتے ہیں، جن کے لیے قرضے جاری جاتے ہیں۔ قرض دینے والے مما لک اِن مخصوص منصوبوں کے لازمی نفاذ اور خاص شرائط کے ذریعے مقروض ملکوں کو اُس راہ پر لگا دیتے ہیں جس سے حقیقت میں مقروض ملک مزید غریب ہو جائیں اور وہاں ابتری پھیل جائے، اور اُن کا مقروض ملکوں پر اثر ورسوخ بڑھ جائے۔ مزید برآں اِس سے مقروض ملکوں کو کوئی حقیقی دولت حاصل نہیں ہوتی۔ مصر اسی کی ایک مثال ہے کہ جس نے اربوں کے قرضے لیے ہیں لیکن اُس کی اقتصادی صورتحال بدستور انحطاط میں گھری ہوئی ہے۔ قرضوں کے لینے سے دولت کی افزائش نہیں ہوتی بلکہ وہ قرض دینے والے مما لک کی گرفت میں مزید پھنستا چلا جاتا ہے۔

قرضے ہر صورت میں خطرناک ہیں خواہ وہ پیداواری منصوبوں پر ہی کیوں نہ لگائے جائیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قرضے اگر قلیل مدت کے لیے دیئے گئے ہوں تو وہ قرض دار ملک کی کرنسی کو بُری طرح متاثر کرتے ہیں، کیونکہ قرض واپس کرنے کے لیے ملکی کرنسی کی بجائے صرف غیر ملکی کرنسی کو قبول کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ غیر ملکی کرنسی کی قلت کی وجہ سے قرض دار ملک غیر ملکی کرنسی میں ادائیگیاں کرنے سے قاصر ہو، جس کی وجہ سے وہ غیر ملکی کرنسی کو مہنگے دام خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جس کا براہِ راست اثر یہ ہوتا کہ اس ملک کی اپنی کرنسی کی قدر میں کمی واقع ہوتی ہے۔ پس وہ ملک IMF کا رُخ کرتا ہے، اور IMF منڈیوں پر تسلط کی امریکی پالیسی کے مطابق اس ملک کی معیشت پر اپنی گرفت کو مزید مضبوط کر لیتا ہے۔ اِور بسا اوقات قرض دار مما لک بیرونی کرنسی کے حصول کے لیے اپنی اشیاء سستے داموں برآمد کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جس سے اقتصادی طور پر وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔

اِس کے برعکس اگر قرضے طویل مدت کے لیے دیئے گئے ہوں تو اس کا مقصد یہ ہوتا

ہے کہ اِس طویل عرصے میں قرضوں کا حجم اِس قدر بڑھ جائے کہ وہ مستقبل میں تجارتی توازن کو بگاڑ دے اور کے ساتھ ساتھ قرض دار ملک اپنی نقدی، سونا یا منقولہ اشیاء(movable properties) کے ذریعے قرض واپس کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ پس اس صورتِ حال میں قرض دار ملک پر دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ وہ یہ ادائیگیاں اپنی غیر منقولہ اشیاء(immovable properties) جیسا کہ، جاگیریں، زمینیں حتیٰ کہ اپنی صنعتیں بیچ کر کرے۔

چنانچہ قرضہ لینے کے تباہ کن نقصانات واضح ہیں۔ ویسے بھی اِن میں سود شامل ہوتا ہے، اِس لیے یہ ہر حالت میں ناجائز ہی ہیں۔

یہاں پر ایک سوال اُٹھ سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ قرض ادا کر دیا گیا ہے، اِس کے بعد ہم دوبارہ نئی دولت اور نئے قرضوں کے بغیر دوبارا اپنے اقتصادی پہیئے کو حرکت میں لا (stimulate) سکتے ہیں؟

اِس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اسلام نے دو طریقے بتائے ہیں:

اوّل: زراعت، صنعت اور تجارت میں ٹھوس اقتصادی پالیسیوں کی منصوبہ بندی کرنا۔

دوم: اسلام نے سرکاری خزانے (بیت المال) پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ ضروری منصوبوں کا آغاز کرے۔

پہلے پہلو کو مختصراًیوں سمجھا جا سکتا ہے:

ا) زراعت:

1: اشیاءِ خوردنی کی پیداوار میں اضافہ کرنا۔

2: ملبوسات میں استعمال ہونے والے میٹیریل جیسے کاٹن، اُون، پٹ سن، اور ریشم کی پیداوار میں اضافہ کرنا۔

3: بیرونی ممالک کی مارکیٹس میں مطلوب اشیاء کی پیداوار میں اضافہ، چاہے وہ اشیاء خوراک سے منسلک ہوں جیسے گندم یا پھر اُن کا تعلق ملبوسات میں استعمال ہونے والے میٹیریل سے ہو جیسے ریشم اور روئی، یا پھر دوسری اشیاء جیسے پھل اور کھجوریں وغیرہ۔

ب) تجارت:

مسلمانوں اور اہل ذمہ (غیر مسلم شہری) دونوں سے کسٹم ٹیکس نہیں لیا جاتا، اور نہ ہی تجارت میں درآمدات اور برآمدات کے لیے اُنہیں کوئی لائسنس بنوانے کی ضرورت ہوتی ہے ماسوائے دو صورتوں میں؛ پہلی یہ کہ وہ ممالک جو مسلمانوں کے ساتھ عملی طور پر حالتِ جنگ میں ہوں (Actual Belligerent States)، اُن کے ساتھ تجارت نہیں کی جاسکتی، اور دوسرا یہ کہ کسی ایسی چیز کی تجارت کرنا منع ہے جس سے ملک کو نقصان ہو۔ ہاں البتہ وہ ممالک جن کے ساتھ معاہدے موجود ہیں، تو اُن کے ساتھ تجارت اُن معاہدات کی شرائط کے مطابق کی جائے گی۔ اور جہاں تک حربی حکماً ممالک (legally belligerent) کا تعلق ہے، جیسا کہ سویڈن تو اُن کے شہریوں کو اپنے ہاں سے ہمارے علاقے میں کچھ بھی لانے کے لیے لائسنس چاہیے ہوگا۔

ج) صنعت:

1: ملک میں موجود قدرتی وسائل کو بروئے کار لانے اور ان کے اندرونِ ملک استعمال یا بیرونِ ملک برآمد کے لیے سخت محنت کرنا ہوگی۔

2: بھاری مشینری کی صنعتوں پر خاص توجہ دی جائے گی تاکہ اِس کے ذریعے مختلف کارخانے لگائے جاسکیں۔ یہ اسے لیے کہ بھاری مشینری کی صنعتیں نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بیرونی ممالک کے رحم وکرم پر ہونگے، کیونکہ اگر کسی مشین میں خرابی واقع ہو جائے یا اگر سپئیر پارٹس (Spare Parts) کی ضرورت پڑے تو پورا پلانٹ رُک جائے گا جب تک کہ وہ چیزیں

درآمد نہ کرلی جائیں۔ اس سے محنت، وقت اور مال (goods) کا زیاں ہوگا۔

دوسرا ہدف ضروریاتی منصوبوں کی تکمیل کا ہے اور اسلام نے اِس کا یہ حل دیا ہے:

الف) وہ تمام منصوبے جن کا پورا کرنا سرکاری خزانے (بیت المال) پر فرض ہے جیسا کہ عوام کے امور کی دیکھ بھال، یعنی وہ امور جو اُن کی بہبود سے متعلق ہوں، تو یہ سب بیت المال میں موجود فنڈز سے مشروط ہیں۔ یعنی اگر بیت المال میں رقم موجود ہے تو اُسے اِن منصوبوں کی تکمیل کے لیے خرچ کردیا جائے گا اور اگر فنڈز موجود نہ ہوں تو اِن منصوبوں کو شروع نہیں کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر پہلے سے موجود سڑک کو چوڑا کرنا یا سکول و ہسپتال کی تعمیر، جبکہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پہلے سے ایک ہسپتال یا سکول موجود ہے تو پھر یہ کام صرف اُس وقت کیا جائے گا جب بیت المال میں فنڈز موجود ہوں۔

ب) وہ منصوبے جن کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے اور اُن کی عدم موجودگی سے عوام کو ضرر پہنچ رہا ہے جیسا کہ ایک علاقے میں سڑک، ہسپتال، کلینک، سکول وغیرہ سرے سے موجود ہی نہیں تو اِیسے منصوبوں کو پورا کرنا بیت المال اور مسلمانوں پر واجب ہے۔ چنانچہ اگر بیت المال میں فنڈز موجود ہیں تو اِن منصوبہ جات پر فوراً خرچ کیا جاتا ہے، لیکن اگر فنڈز موجود نہیں تو دولت مند مسلمانوں پر ٹیکس لگایا جاتا ہے، اور یہ اُن کے اُس مال پر لگتا ہے جو اُن کی بنیادی ضروریات اور عام زندگی کی آسائشوں سے زائد ہو۔ یہ ٹیکس اُسی زائد مال کے تناسب سے لیا جائے گا۔ اور اُس کی مقدار اُن منصوبوں کے مطلوبہ اخراجات جتنی ہوگی۔ یہ اموال قرآن وسنت کے احکامات کے مطابق لیے جائیں گے کیونکہ اسلام نے ریاست کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ اپنی مرضی کے ٹیکس لگائے، کیونکہ اسلام میں بغیر شرعی دلیل کے کسی کا مال بھی لینا حرام ہے اور ایک سنگین گناہ ہے، جس کی ایک مثال مسلمانوں اور اہل ذمہ پر کسٹم ٹیکس لگانے کی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لا يدخل الجنة صاحب مكس))

"کسٹم ٹیکس لینے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا"

جس سے مراد وہ شخص ہے جو عوام پر کسٹم ڈیوٹی نافذ کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

((لا يحل مال امرى مسلم الا بطيب نفسه))

''ایک مسلمان کی ملکیت حلال نہیں سوائے اُس کی اجازت سے''

ہاں البتہ وہ منصوبے جنہیں مکمل کرنے کی ذمے داری مسلمانوں اور بیت المال پر واجب ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، لیکن اُن کے لیے پیسے موجود نہیں تو پھر ٹیکس لگانا شرعاً حرام نہیں بلکہ جائز ہے کیونکہ اِن منصوبوں کی تکمیل کا فرض شریعت نے ہی مسلمانوں پر عائد کیا ہے، لہٰذا اُن سے اِن منصوبوں کے لیے پیسہ اکٹھا کرنا بھی لازمی ہو جاتا ہے کیونکہ شرعی قاعدہ ہے کہ ''وہ چیز، جس کے بغیر ایک فرض پورا نہ ہو سکتا ہو، وہ خود بھی فرض بن جاتی ہے۔'' لہٰذا یہ ٹیکس اُن تمام منصوبوں کے لیے لاگو ہوتا ہے جو اُمت پر واجب ہیں جیسا کہ تعمیراتی منصوبے اور دیگر ترقیاتی کام مثلاً بھاری مشینری کی صنعتوں کا قیام جو کہ ملک کے لیے اشد ضروری ہیں، کیونکہ اِن کے بغیر مسلمانوں کو اسلحے اور دیگر صنعتی شعبوں کے لیے کفار پر انحصار کرنا پڑے گا، اور یہ ضرر (نقصان) ہے جبکہ ''نقصان (نہ اپنے آپ کو پہنچانا جائز ہے) اور نہ دوسروں کو''۔ پس ضرر کو دور کرنا لازم ہے لہٰذا بھاری مشینری کی صنعتیں مسلمانوں پر ایک فرض بن جاتی ہیں۔ چنانچہ ریاست کو بھاری مشینری کی صنعتیں قائم کرنی ہونگی چاہے بیت المال میں پیسے ہوں یا نہ ہوں۔

یہاں یہ سمجھنا اہم ہے کہ امیر مسلمانوں پر اُتنا ہی ٹیکس لگتا ہے کہ جتنا اُن منصوبوں کی ضرورت ہے اور اِس سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ اگر منصوبے کی ادائیگی فوری نقد کی شکل میں ہے تو پھر پورے اخراجات کے برابر ٹیکس لیا جائے گا۔ اور اگر منصوبوں کے اخراجات کی ادائیگی کا طریقہ قسطوں میں ہے، تو ادائیگی کے ہر موقعہ پر اُتنا ہی ٹیکس لیا جائے گا جتنا قسط ادا کرنے کے لیے ضرورت ہے۔ یہ معاملہ بالکل credit facility کی طرح کا ہے جہاں منصوبوں کے لیے درآمد کی گئی مشینوں اور آلات کی ادائیگیاں ایک قسط وار (defferred) قیمت کی شکل میں ادا کی جاتی ہیں۔ یہ اُن جگہوں پر ہے جہاں اسلام نے ایک شے کی دو قیمتوں کی اجازت دی ہے جس میں ایک قیمت وہ ہوتی ہے جو فوری طور پر نقد کی ادائیگی سے ہوتی ہے اور دوسری وہ جو قسط وار ہوتی

ہے اور کچھ عرصے بعد دی جاتی ہے یعنی ایک متعین مدت کے لیے وہ قرض ہوتی ہے۔ یہ بھاؤ تاؤ (bargaining) کے زمرے میں آتی ہے جس کے تحت دونوں قیمتوں میں سے کسی ایک پر بات طے کی جاسکتی ہے، حدیث میں ہے:

((فان الرسول ﷺ ساوم کما روی أنس (رضی اللّٰہ عنه) . وقد قال علی(رضی اللّٰہ عنه): "من ساوم بثمنین أحدهما عاجل والآخر نظرة فلیسم أحدهما قبل الصفقة"))

"نبی کریم ﷺ نے بھاؤ تاؤ کیا جیسا کہ انسؓ روایت کیا کہ علیؓ نے فرمایا: "جس کسی نے بھی دو قیمتوں کے درمیان بھاؤ تاؤ (bargaining) کیا، یعنی ایک نقد اور دوسرا بعد میں قسط وار ادائیگی (defferred payment) کی صورت میں تو وہ عقد (deal) کرنے سے پہلے اُسے بتا دے"

چنانچہ کسی بھی ایسے عقد کو حتمی ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس کی قیمت شروع سے بتا دی جائے، اور خرید و فروخت پھر اُسی قیمت پر ہوگی۔ البتہ جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کہ ایک مشین کو نقد کے عوض خریدا جائے اور بعد میں اُس کی قیمت اور سود کو خریدار کے نام قرضے کے طور پر لکھا جائے تو یہ ناجائز ہے کیونکہ یہ سود کے زمرے میں آئے گا نہ کہ ایک متعین وقت کے بعد ہونے والی قسط وار ادائیگی (deferred sales) کے۔

یہاں پر ہم ٹیکسوں کے مسئلے پر تھوڑی تفصیلی بات کریں گے۔

لوگوں کی ملکیت کا اسلام میں اِس حد تک تحفظ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اُس شخص کو، جو اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے، اُسے شہید کہا ہے، جس سے ایک شخص کی اپنے مال کی حفاظت کرنے کے عمل کے عظیم اجر کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ علاوہ ازیں کسی مسلمان کی دولت کو بغیر اُس کی اجازت کے جبراً لینا حرام ہے۔ تو چاہے وہ حاکم ہو یا عام شہری، کسی کو اجازت نہیں کہ وہ کسی سے اس کا مال جبراً لے جب کہ اُس نے جائز طریقوں سے اُسے حاصل کیا ہو۔

لہذا ریاست کو یہ اجازت نہیں کہ وہ لوگوں کے اموال پر اپنی مرضی سے ٹیکس لگائے۔ لوگوں کی آمدنی پر ٹیکس لگانا حرام ہے اور اِسی طرح مسلمانوں اور اہل ذمہ تاجروں پر کسٹم ڈیوٹیاں لگانا بھی حرام ہے۔ لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کے بہانے یا اِسی طرح دوکانوں کی سیکیورٹی اور اِس جیسے دیگر امور کے نام سے فیس عائد کرنا بھی حرام ہے۔ یہ سب فیسیں اور ٹیکس حرام ہیں کیونکہ جائز طریقوں سے حاصل کردہ مال پر مالک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اُسے استعمال کرے اور مال بٹورنے والے ہتھکنڈوں اور کرپٹ غاصبوں سے اُس کا تحفظ کرے۔ شریعت ہی نے انسان کو ملکیت کی اجازت دی ہے اور شریعت کے علاوہ کوئی نہیں جو اِس ملکیت کی اجازت کو روکے۔ چنانچہ لوگوں سے اُن کی ملکیت لینا (یعنی ٹیکس) صرف کسی شرعی نص کی بنیاد پر ممکن ہے۔ اور یہ شرعی نص ایک حوالے سے ہی ملتی ہے، جو کہ مشہور شرعی قاعدے کے زمرے میں ہے: ((ما لا یتم الواجب الا به فهو واجب)) ''وہ چیز، جس کے بغیر ایک فرض پورا نہ ہوسکتا ہو، وہ خود بھی فرض بن جاتی ہے۔'' لہذا اگر ایک منصوبہ ایسا ہے جو کہ مسلمانوں پر فرض ہے اور سرکاری خزانے میں اِس کے لیے پیسے ناکافی ہیں تو پھر ریاست لوگوں کے اموال کے ذریعے اِسے مکمل کرے گی تو وہ اُتنا ٹیکس عائد کرے گی جو اُس منصوبے کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے درکار ہو۔ یہ ٹیکس صرف مالدار مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے کیونکہ شرعی نصوص سے ثابت ہے کہ اُن مالیاتی امور کی تکمیل جو کہ فرض ہیں، وہ امیر مسلمانوں (غنی) کے اضافی دولت پر ٹیکس لگا کر پورے کیے جاتے ہیں، اور اسلام میں غنی وہ ہے جس کے پاس اس کی بنیادی ضروریات اور عام زندگی کی آسائشوں سے زائد مال موجود ہو۔

لہذا ضروری منصوبوں کی تکمیل کے لیے درکار فنڈز کے لیے ٹیکس عائد کرنے لیے اسلام نے دو شرائط لگائی ہیں:

1) اِس منصوبے کی ذمہ داری کے بیت المال یعنی ریاست اور مسلمانوں پر فرض ہونے، کی دلیل شریعت سے ثابت ہونی چاہیے۔ جیسا کہ کوئی ایسی ضروری سڑک کا منصوبہ جہاں کوئی متبادل سڑک نہ ہو یا کوئی ہسپتال، ایک ایسے علاقے میں جہاں کوئی اور ہسپتال نہ ہو، یا بھاری مشینری جن

کی عدم موجودگی امت کے لیے باعثِ ضرر ہو، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لا ضرر ولا ضرار))

''نقصان (نہ اپنے آپ کو پہنچانا جائز ہے) اور نہ دوسروں کو''

2) ٹیکس عائد کرنے کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ بیت المال میں موجود اموال اِن منصوبوں کے لیے کافی نہ ہو۔ یعنی اگر دونوں شرائط موجود نہ ہوں تو ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا۔ چنانچہ اگر منصوبے کی نوعیت لوگوں کی دیکھ بھال کے لحاظ سے عمومی نوعیت کی ہو لیکن اُس کا سرانجام دینا فوری طور پر لازم نہیں جیسا کہ ایک ایسی سڑک کی تعمیر جس کی اشد ضرورت نہیں، یا ایک ہسپتال موجود ہے اور دوسرے کی تعمیر، اِن صورتوں میں یہ منصوبے صرف اُس وقت مکمل کیے جائیں گے جب بیت المال میں اموال ہوں اور اگر موجود نہیں تو اِن کی تکمیل کے لیے الگ سے ٹیکس نہیں لگائے جائیں گے۔ اِسی طرح اگر منصوبے کی فوری تکمیل لازمی ہے اور بیت المال میں اموال موجود ہیں تو اِس صورت میں بھی ٹیکس عائد نہیں کیا جائے گا اور منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔

اِس طریقے سے قرضوں کے مسئلے کو صحیح طور پر حل کیا جاسکتا ہے، مزید برآں مزید قرضوں میں دام میں پھنسے بغیر ملکی معیشت کو ترقی دی جاسکتی ہے اور امت پر واجب پیداواری اور تعمیراتی منصوبوں کو بخوبی پایہ تکمیل تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

سوم: وہ اقتصادی مسائل جو دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے پیدا ہوتے ہیں:

جیسا کہ ہم پہلے بھی بات کر چکے ہیں، کہ صرف کرپشن اور ادائیگیوں کے توازن سے پیدا ہونے والے بحران کو حل کرنے سے اقتصادی مسئلہ حل نہیں ہوگا کیونکہ یہ مسئلہ کوئی ریاضی کا سوال (mathematical abstract) نہیں۔ ممکن ہے کہ آمدن اور اخراجات برابر ہوں لیکن دولت کی غلط تقسیم سے بھی مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے۔ باالفاظِ دیگر ہوسکتا ہے کہ پیداوار بہت بڑھ جائے لیکن زیادہ تر اشیاء اور سہولیات ملک کے چند لوگ حاصل کرلیں اور باقی سب محروم رہ

جائیں۔ مزید برآں بحرانوں کی وجہ سے قرض کے مسئلے کے ساتھ ساتھ عموماً غربت اور بے روزگاری بھی جنم لیتی ہے۔ تو ضروری نہیں کہ قرضوں کے مسئلے کے حل سے غربت اور بے روزگاری کا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ تاہم اسلام اِس مسئلے کا بھی موزوں ترین اوراطمینان بخش حل فراہم کرتا ہے، جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

1) اوپر بیان کی گئیں معاشی پالیسیوں کے نفاذ کے نتیجے میں زراعت، صنعت اور تجارت کے شعبوں میں روزگار اور ملازمتوں کے مواقع پیدا ہونگے۔ اِسی طرح اُن منصوبوں کا آغاز بھی ہوگا جو کہ امت پر واجب ہیں اور جن پر بیت المال سے خرچ کیا جائے گا اور اگر بیت المال میں فنڈز ناکافی ہوں تو امیر مسلمانوں پر ٹیکس لگا کر اِن منصوبوں کی تکمیل کی جائے گی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر حال میں یہ منصوبے شروع کیے جائیں گے۔

2) اسلام نے ریاست میں رہنے والے ہر فرد کے لیے بنیادی ضرورت کی چیزوں کی فراہمی کو یقینی بنایا ہے اور یہ ضروری بنیادی اشیاء اُس معیار کے مطابق روٹی، کپڑا اور مکان کی فراہمی ہے جو اس ملک میں اس درجے کے افراد کو عام طور پر حاصل ہوتا ہے، اور جن پر شرعی نصوص دلالت کرتے ہیں۔ اِن بنیادی چیزوں کی فراہمی اسلام نے اِس طرح یقینی بنائی ہے:

ا) اسلام نے ہر اُس مرد پر کام کرنا واجب کیا ہے جس کے پاس بنیادی ضروریات کی چیزیں نہ ہوں اور وہ کام کرنے کی استطاعت بھی رکھتا ہو۔

ب) اسلام نے ہر عورت کے لیے مالی نان ونفقہ کو ہر صورت فرض قرار دیا ہے چاہے وہ عورت اپنا نان ونفقہ کمانے کی استطاعت رکھتی ہو یا نہیں۔ یہ نان ونفقہ اُس شخص کا پورا کرنا بھی فرض ہے جو غریب ہو خواہ وہ کام کرنے کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے اپنے اخراجات برداشت نہ کرسکتا ہو یا پھر کام کرنے کے قابل تو ہو لیکن نوکری نہ مل رہی ہو۔ اُس کی تفصیلات کچھ اِس طرح ہیں:

اسلام نے بیوی کے لیے شوہر پر، بچوں کے لیے باپ پر، والدین کے لیے بیٹوں پر، اور ہر رشتے دار کے لیے اس کے ورثاء پر مالی نان ونفقہ کی ذمہ داری عائد کی ہے۔ یہ سب واضح شرعی دلائل سے ثابت ہے۔

ریاست یہ نان ونفقہ اُن لوگوں سے لازمی جمع کرتی ہے جن پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور یہ تمام طرح کے قرضوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ یعنی نان ونفقہ کے حوالے سے عدالت کے فیصلے کو نافذ کیا جائے گا اور تنگدستی کے عذر کو قبول نہیں کیا جائے گا، جبکہ قرضداری کے فیصلہ میں تنگدستی کے عذر کو قبول کیا جائے گا۔ چنانچہ اسلام نے ریاست کے شہریوں کو تمام بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کو مالی نان ونفقہ کے ذریعے پورا کیا ہے سوائے دوصورتوں میں:

1) اگر کسی شخص کا کوئی وارث نہیں۔

2) جس پر نان ونفقہ کی ذمہ داری عائد ہے وہ پورا کرنے کے قابل نہیں۔

اِن دوصورتوں میں نان ونفقہ کی ذمہ داری ریاست کے بیت المال پر عائد ہوتی ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((من ترك كلا فالينا ومن ترك مالاً فلورثته))

''جس کسی نے بھی اپنے پیچھے 'کلالہ' چھوڑا تو اُس کی ذمہ داری ہم پر ہے اور جس کسی نے کوئی مال چھوڑا تو وہ اُس کے ورثاء کے لیے ہے'' ('کال' ایسے کمزور شخص کو کہتے ہیں جس کا نہ باپ ہو اور نہ بیٹا)

چنانچہ اِن کے نان ونفقہ کی ذمہ داری بیت المال پر ہے چاہے اُس میں اموال ہوں یا نہ ہوں۔ یہ اِس لیے کہ یہ فرض بیت المال اور مسلمانوں پر ہے۔ بیت المال پر ذمہ داری کی دلیل تو واضح ہے لیکن جہاں تک مسلمانوں پر ذمہ داری کی بات ہے تو وہ نبی کریم ﷺ کی اِس حدیث کی وجہ سے ہے:

((أيما أهل عرصة أصبح فيهم امرؤ جائع فقد برئت منهم ذمة اللّٰه تبارك و تعالیٰ))

''کسی بستی میں اگر ایک شخص بھی بھوکا ہوتو اللہ سبحانہ تعالیٰ اُس بستی سے تمام سے اپنا ذمہ اُٹھالیتا ہے۔''

لہٰذا اگر بیت المال میں اموال کافی نہ ہوں تو ٹیکس عائد کیا جاتا ہے۔ اگر مشکلات متوقع ہوں تو فوراً ادھار رقم حاصل کی جائے گی جو بعد میں لگائے جانے والے ٹیکس سے واپس کردی جائے گی۔ چنانچہ، غرباء کی تمام بنیادی ضروریات پوری کی جاتی ہیں چاہے وہ (رشتے داروں کے) نان ونفقہ اور زکوٰۃ کے ذریعے ہو اور نہ ہونے پر پھر بیت المال کے ذریعے، جہاں اسے دیگر اموال سے حاصل کیا جائے گا اور اگر یہ کافی نہ ہوں تو پھر امیر مسلمانوں پر ٹیکس عائد کر کے اِن بنیادی ضروریات کو پورا کیا جائے گا۔

مالی نان ونفقہ اور ٹیکس دولت سے لیے جاتے ہیں یعنی قانونی طور پر صاحبِ استطاعت کے اُس مال سے جو اُس کی بنیادی ضروریات اور آسائشوں سے زائد ہو، یعنی وہ مال جو اُس کی روزمرہ زندگی کی ضروریات سے بڑھ کر ہو۔ اِس طرح افراد کی بنیادی ضروریات کی دیکھ بھال ہوگی اور غربت اور بے روزگاری کے مسائل کا ازالہ کیا جائے گا۔

اسلامی ریاست تمام شہریوں کے علاج معالجے، تعلیم اور سیکورٹی کو بھی بنیادی ضروریات گردانتے ہوئے شرعی نصوص کے مطابق، اُسی طریقے کے ذریعے یقینی بناتی ہے جس طرح پچھلی ضروریات کے ضمن میں اوپر بیان کیا گیا۔

یہاں پر یہ بات قابلِ غور ہے کہ بیت المال میں موجود اموال عموماً غنی (امیر مسلمانوں) پر ٹیکس لگائے بغیر ہی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ شریعت نے یہ قوانین ترتیب دیئے ہیں تاکہ اِن کے ذریعے ہر مسئلے کو حل کیا جاسکے خواہ وہ کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت پیدا ہوا ہو۔ البتہ اگر کبھی بیت المال کے اموال کم پڑ جائیں تو تب امیر مسلمانوں پر ٹیکس

لگا کر اِن ضروریات کو یقینی بنایا جاتا ہے۔

صورتحال کو مزید واضح کرنے کے لیے میں ذیل میں اسلام کی ریاستِ k000 میں مستقل بنیادوں پر جمع کئے جانے والے ذرائع آمدن کو بیان کرتا ہوں:

بیت المال میں آمدن کے مستقل ذرائع:

جنگوں سے حاصل شدہ مالِ غنیمت، جزیہ، زمینی ٹیکس (عشر، خراج)، مدفن خزانوں کا پانچواں حصہ (رکاز)، ریاستی املاک، اہلِ معاہدہ ممالک یا جنگ میں ملوث ممالک کے لوگوں سے حاصل کردہ کسٹم ٹیکس، ملکیتِ عامہ (Public Property) سے حاصل کردہ آمدنی، اُن لوگوں کا وراثتی مال جن کے کوئی وارث نہیں، والیوں اور سرکاری عہدیداروں سے ضبط کردہ ناجائز مال، جرمانوں سے اکٹھا ہونے والا مال، مرتدین کا مال اور ٹیکس۔

اِن تمام باتوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام اقتصادی بحران کا مکمل اور صحیح حل دیتا ہے اور لوگوں کو اِس دنیا میں خوشحال اور عمدہ زندگی کا تحفظ دینے کے ساتھ ساتھ اُن کی آخرت کو بھی بچاتا ہے۔

خلاصہ:

اقتصادی بحران ریاست کے مالی امور کی تنظیم و انصرام میں ایسے شدید مسئلے کو کہتے ہیں جسے دور کرنے کے لیے سخت کوشش کرنی پڑے۔

کرنسی اور سونے کے تبادلے کے نظام میں پیدا ہونے والے بحران کی وجہ وہ ملک ہے جو دوسرے ممالک کی طرف سے ذخائر (Rserves) کے طور پر رکھی جانے والی کرنسی کا مالک ہوتا ہے اور اُس کے ذریعے دیگر ممالک پر اپنا اقتصادی اور سیاسی بالادستی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کھوکھلے کاغذی نوٹ (fiat currency) کے نظام میں بھی پیدا ہوتا ہے جہاں ملکوں کے درمیان کرنسی کی قدر اونچ نیچ سے دوچار رہتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ مالیاتی سازشوں کا شکار ہونے

کی وجہ سے ایک ملک کو سیاسی اور اقتصادی بدامنی کی طرف لے جاتی ہے اور اُس کی مالیاتی مارکیٹوں کے اقتصادی لحاظ سے گرنے کا باعث بنتی ہے۔ اِس مسئلے کا حل سونے کی بنیاد (Gold Standard) کے نظام کی طرف واپس لوٹنا ہے جو کہ قیمتِ خرید وفروخت میں استحکام اور اقتصادی خوشحالی کا سبب ہوتا ہے۔

خسارے کی وجہ سے ادائیگیوں میں عدم توازن کے نتیجے میں جنم لینے والے بحران کی وجہ سے ملک مقروض ہو جاتا ہے، اگر اُس کی معیشت اپنے پاؤں پر کھڑی نہ ہو اور اگر قرضوں کا غلط استعمال ہو کیونکہ یہ قرضے بیرونی اثر ورسوخ بڑھانے کے خطرے سے خالی نہیں ہوتے اور سودی لین دین کے باعث بھی خطرناک ہوتے ہیں جو کہ اسلام میں منع ہے۔

IMF کی طرف رجوع کرنے سے مسئلہ مزید گھمبیر ہو جاتا ہے، کیونکہ IMF اِس مسئلے کو محض ایک حسابی مساوات (mathematical equation) کے طور پر دیکھتا ہے اور نتیجتاً ٹیکس بڑھانے، کرنسی کی قدر گرانے، تنخواہوں کو منجمد یا کم کرنے، سبسڈی کے خاتمے، اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی امداد کو ایسے منصوبوں کے ساتھ منسلک کرتا ہے جو ملک کی دولت بڑھانے کی بجائے اُس کو مزید قرضوں اور امداد کا محتاج بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ملک قرضوں کے ایک ایسی دلدل میں پھنس جاتا ہے، جس سے وہ نکل نہیں سکتا۔ IMF کی پالیسیوں کو اپنا کر زیادہ سے زیادہ یہ ملک اِن قرضوں کی واپسی کی مدت بڑھوا سکتا ہے لیکن اِن سے نجات بہرحال حاصل نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں IMF مزید قرضے لینے آسان بنا دیتا ہے جس سے ملک پر عائد قرضوں کا حجم بڑھ جاتا ہے اور ملک اِس سے نجات حاصل نہیں کر پاتا، جیسا کہ آج کل بیشتر ممالک کے ساتھ ہو رہا ہے۔

جہاں تک دولت کی غیر منصفانہ تقسیم یا اُس کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے غربت اور بے روزگاری کے مسئلے کا تعلق ہے تو اِس کا حل ریاست کی جانب سے نئے منصوبوں کے قیام کے ذریعے استطاعت مند افراد کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ تمام

عورتوں اور استطاعت نہ رکھنے والے مردوں کے لیے اُن کے محرموں کے ذریعے نان ونفقہ کے بندوبست کے ذریعے ہوتا ہے۔ اگر اُن ورثاء میں نان ونفقہ دینے کی گنجائش نہ ہوتو ریاست اِن کی بنیادی ضروریات کی دیکھ بھال کے لیے ذمہ دار ہوتی ہے جسے وہ بیت المال سے پورا کرتی ہے، اور اگر بیت المال میں گنجائش نہ ہوتو پھر امیر مسلمانوں کی زائد دولت پرٹیکس لگا کر اِس ذمہ داری کو پورا کیا جاتا ہے۔

ریاست تمام ملک کی بنیادی ضروریات کی دیکھ بھال کو اُسی طرح یقینی بناتی ہے جس طرح وہ ہر فرد کی ضروریات کو یقینی بناتی ہے۔ ایک فرد کے لیے بنیادی ضروریات سے مراد اُس زمانے کے رائج پیمانوں کے مطابق خوراک، کپڑا اور مکان ہیں۔ جبکہ پورے ملک کی بنیادی ضروریات سے مراد تعلیم، صحت اور سیکورٹی ہے۔ اِن کی ضروریات کو بیت المال سے پورا کیا جاتا ہے اور اگر اموال نہ ہوں تو زائد ٹیکس لگا کر۔

دیگر اضافوں کے علاوہ بیت المال کے مستقل ذرائع آمدن میں جنگوں سے حاصل شدہ مالِ غنیمت، جزیہ، زمینی ٹیکس (عشر، خراج)، مدفن خزانوں کا پانچواں حصہ (رکاز)، ریاستی املاک، کسٹم ٹیکس، ملکیتِ عامہ (Public Property) سے حاصل کردہ آمدنی، اُن لوگوں کے وراثت کا مال جن کے کوئی وارث نہیں، والیوں اور سرکاری عہدیداروں سے ضبط کردہ ناجائز مال، جرمانوں سے اکٹھا کیا گیا مال، مرتدین کا مال اور بوقتِ ضرورت لگائے جانے والے ٹیکس شامل ہیں۔ یہ اموال عموماً ریاست کے امور چلانے کے لیے کافی ہوتے ہیں، خاص طور پر اُس صورت میں جب اقتصادی امور کو صحیح طور سے چلایا جارہا ہو۔

انشاءاللہ ریاستِ خلافت عنقریب قائم ہونے والی ہے، اور اِس کے پاس تمام مسائل کا مکمل اور صحیح حل ہوگا چاہیے اُن مسائل کا تعلق اقتصادیات سے ہو یا کسی اور مسئلے سے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس میں اقتدارِ اعلیٰ شریعت کے پاس ہوتا ہے اور اتھارٹی امت کے پاس ہوتی ہے۔ اِس کا ایک خلیفہ ہوتا ہے، جس کو اللہ کی کتاب اور نبی کریم ﷺ کی سنت پر بیعت دی جاتی ہے اور وہ

احکامِ شرعیہ کی تبنی کرتا ہے۔ لہٰذا وہ اور امت اپنے تمام اعمال کے متعلق اللہ سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ زندگی کے تمام امور اللہ کے احکامات کے مطابق چلائے جائیں گے جو مسلمانوں کے لیے تمام امور میں کامیابی کا باعث بنے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهُ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾

''بے شک اللہ اُس کی مدد کرے گا جو اُس کی مدد کریں گے اور بے شک اللہ طاقتور اور قادرِ مطلق ہے'' (الحج:40)